ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

(الحدید : ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا

جس میں جنگ کی بڑی قوت ہے

اور لوگوں کے لیے بڑے فوائد بھی ہیں۔

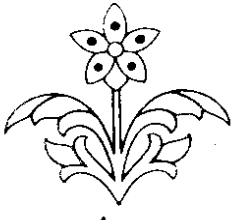

اتفاق فاؤنڈریز لمیٹڈ

۳۲۔ ایمپریس روڈ۔ لاہور

قرآن اکیڈمی لاہور

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۴ | اکتوبر ۱۹۸۵ء بمطابق محرم الحرام ۱۴۰۶ھ | شمارہ: ۸

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۱۱

★ حرفِ اوّل ——— ۳

عاکف سعید

★ حِکَم و عِبَر ——— ۵

فرقہ واریت — آج کا سنگین مسئلہ

اس سے نجات کی کیا شکل ہو ؟

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

★ الٓمٓ (سورۂ بقرہ) ——— ۱۱

ڈاکٹر اسرار احمد

★ قرآن اور رمضان المبارک کا ربط و تعلق ——— ۱۷

ڈاکٹر اسرار احمد

★ ہدایت القرآن (۳) ——— ۳۰

مولانا محمد تقی امینی

★ اسلام کی معاشی تعلیمات — چند اہم پہلو ——— ۴۰

حافظ محمد سلیمان

★ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم ——— ۴۹

علمی تبحر، اعتدال اور فقہی توسع کی حامل شخصیت

حافظ صلاح الدین یوسف

★ نعتیہ شاعری کا انحطاطی پہلو ——— ۵۸

سلیم فاروقی

★ تبصرہ کتب ——— ۶۵

ادارہ

سالانہ زرِ تعاون -/۳۰ روپے — فی شمارہ -/۳ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

عاکف سعید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرفِ اوّل

'حکمتِ قرآن' کا گذشتہ شمارہ اسلام کے معاشی نظام کے موضوع پر ایک خصوصی اشاعت پر مبنی تھا ـــــ معاشی مسئلہ، اگرچہ ہر دور میں بنی آدم کے بنیادی مسائل میں سے رہا ہے لیکن اس دور میں متعدد اسباب کی بنا پر اس کی اہمیت کئی چند ہو چکی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اس مسئلے کی جانب خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی، تقسیم دولت کا غیر منصفانہ نظام جوں کا توں رہا اور اسلام کی معاشی تعلیمات کو ان کی اصل روح کے ساتھ پیش نہ کیا گیا تو حالات کا بہاؤ جس جانب ہے، اس سے کوئی ذی شعور بے خبر نہیں اور اس سلسلے میں نوشتہ دیوار کسی چشم بینا سے مخفی نہیں ـــــ

اس دور میں جبکہ شریعتِ اسلامی کے نفاذ کا بہت چرچا ہے اور اس معاملے میں حکومت کی طرف سے بلند بانگ دعاوی سامنے آرہے ہیں کہ ہم نے اپنی معیشت کو سود سے پاک کرنے کے کام کا آغاز کر دیا ہے، ایک بہت بڑا سوالیہ نشان یہی لوگوں کے ذہنوں پر ثبت ہے کہ کیا نظامِ معیشت میں بنیادی تبدیلیاں لائے بغیر محض چند لیبل بدلنے سے ہماری معیشت سود سے پاک ہو چکی ہے اور کیا اسلام کے معاشی نظام سے یہی کچھ مراد ہے! خاص طور پر غریب طبقات میں یہ بے چینی بہت تیزی سے پھیل رہی ہے کہ اگر اسلام کا معاشی نظام یہی کچھ ہے تو گویا معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کے مسائل کا کوئی حل اسلام کے پاس موجود نہیں ہے اور ہمارے لئے اسلام کا دامن خالی ہے ـــــ ـــــ حالانکہ معاملہ اس سے بہت مختلف ہے، اسلام نے جو نظام نوعِ انسانی کو دیا تھا اس کا جامع عنوان ہے 'نظامِ عدلِ اجتماعی' سورۂ شوریٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا کہ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ۔ یعنی میں صرف واعظ و ناصح بن کر نہیں آیا بلکہ تمہارے مابین عدل کرنا یا بالفاظِ دیگر عدل و قسط پر مبنی نظام بالفعل قائم کرنا میری بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے ـــــ سورۃ حدید میں یہ مضمون مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

تحقیق، ہم نے بھیجے اپنے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

غور کیجئے! اس آیت مبارکہ میں نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کو سلسلۂ نبوت و رسالت کے بنیادی مقاصد میں سے قرار دیا گیا ہے۔ تفصیلات کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ہمیں محض اشارات پر اکتفا کرنا ہوگا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اسلامی نظامِ اجتماعی کا نمایاں ترین وصف 'عدل و قسط' ہے۔ ——— اور یہ عدل معاشرے کی ہر سطح پر مطلوب ہے۔ خواہ وہ سماجی ہو یا معاشرتی اور سیاسی ہو یا معاشی ——— ! سماجی و معاشرتی سطح پر یہ عدل اخوت و مساوات کی شکل میں ظہور کرتا ہے، سیاسی سطح پر حریت اور آزادیٔ رائے اس نظامِ عدلِ اجتماعی کا ثمرہ ہے اور معاشی سطح پر یہی عدل ——— 'کفالتِ عامہ' کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے اور ایک اسلامی حکومت کی یہ بنیادی ذمہ داری قرار پاتی ہے کہ وہ خود کو اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی کفیل متصور کرے۔ دورِ خلافتِ راشدہ کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت یہی تھی کہ وہاں یہ نظامِ عدلِ اجتماعی اپنی اعلیٰ ترین سطح پر نظر آتا ہے۔ انسانی اخوت و مساوات کے جو مناظر اس دور میں چشمِ فلک نے دیکھے وہ اب صرف کتابوں میں ملتے ہیں، انسانی حریت اور آزادیٔ رائے کے جو مظاہر اس دور میں سامنے آئے اب نوعِ انسانی انہی کی تمنا اور آرزو کے سہارے جی رہی ہے اور کفالتِ عامہ کا جو تصور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیش کیا وہ قیامت تک کے لئے کسی بھی ویلفیئر اسٹیٹ کے لئے آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تھے اسلامی نظامِ عدلِ اجتماعی کے ثمرات! اقبالؔ نے اس بات کو بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

یہ بات واضح رہے کہ کوئی بھی نظام جس میں ان تینوں سطحوں پر عدل و انصاف سے صرف نظر کیا گیا ہو، ہرگز اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔ خواہ بظاہر اس کے اوپر سرکاری سطح پر اقامتِ صلوٰۃ کے سطحی اہتمام اور زکوٰۃ کمیٹیوں کی تشکیل کے ذریعے اسلام کا غازہ مل دیا گیا ہو ——— مگر نظام انہی باطل اصولوں پر قائم ہے، سیاسی جبر و استبداد کی فضا اسی طور پر برقرار ہے، سماجی سطح پر رنگ و نسل کی بنیاد پر اونچ نیچ کا معاملہ وہیں ہے اور تقسیمِ دولت کا وہ غلط نظام جس میں سرمایہ دارانہ

——— (باقی صفحہ ۷۰ پر) ———

حکم و عبر

محمد سعید الرحمٰن علوی

فرقہ واریت — آج کا سنگین مسئلہ

اس سے نجات کی کیا شکل ہو؟

کچھ عرصہ سے ہمارے یہاں ایک مسئلہ بہت ہی نازک شکل اختیار کر چکا ہے — اور وہ ہے فرقہ وارانہ مسئلہ — ہم نے مختلف مواقع پر اس کی سنگینی کے متعدد مظاہر دیکھے۔ دو سال قبل شاہی مسجد لاہور کی مجلس قرأت کے حوالہ سے لاہور میں جو کچھ ہوا اور دو ماہ سے زائد "اسلامیان پاکستان" عدالتی ٹریبونل میں جس طرح حلف اٹھا اٹھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کہتے رہے، اس کا ہمیں ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ کیونکہ ۲، ۳ ابتدائی دن چھوڑ کر اس پوری کارروائی کو ہم نے بچشم خود دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا۔ رمضان المبارک کا پورا مہینہ — وہ محترم اور مقدس مہینہ — اسی حال میں گذرا کہ صبح ۸ بجے سے بسا اوقات ۲، ۴ بجے تک ہم وہاں رہے — خوف اور ڈر محسوس ہوتا تھا کہ اس کذب بیانی، دروغ بافی پر عذاب الٰہی ٹوٹ نہ پڑے، عدالت کی چھت گر نہ جائے — پھر سوچتے کہ آخر یہ بھی عذاب کی ایک شکل ہے — (قرآن عزیز میں الانعام، آیت ۶۵ میں ہے "اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (یا تم کو کئی فرقے کر کے آپس میں بھڑا دے اور تم میں بعض کو بعض کی لڑائی کا مزہ چکھا دے)۔

اس بیسویں صدی میں — سائنسی صدی میں، جبکہ عفریت انسان شمس و قمر پر کمندیں پھینک رہا ہے، ہمارے یہاں ان عجیب و غریب معاملات نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اور پھر یہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں، اہل اسلام اور مسلمانوں کے ازلی دشمن دانا یانِ فرنگ کے دیس "یورپ" تک میں یہ وبا پہنچ چکی ہے۔ اور بری طرح وہاں پھیل کر مسلمانوں کی "سوختہ سامانی" کا اہتمام کر رہی ہے — حالیہ عید الاضحیٰ کے دن عین نمازِ عید کی ادائیگی کے وقت مانچسٹر (برطانیہ) کی مسجد کے گیٹ پر "ایک مسلمان دوسرے مسلمان" کے ہاتھوں قتل ہو گیا، یہ حرکات وہ لوگ کر رہے ہیں جن کے آقا و قائد محمد عربی علیہ السلام نے انسانیت

کے احترام سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے حُسنِ سلوک کا سبق پڑھایا تھا۔ اور یہ حرکتیں ہو رہی ہیں ان دیار میں جو اسلام اور مسلمانوں کے ازلی دشمن، ان کی آزادی کے دشمن اور صدیوں ان پر مسلط رہ کر خونی حرکات کرنے والے ہیں ـــــ جن مسلمانوں کے آباء و اجداد نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر اپنے اپنے ممالک بالخصوص برِعظیم ہند و پاک میں دانایانِ فرنگ کو ناک چنے چبوائے تھے ـــــ وہ مسلمان آج ان کی دھرتی پر اپنے "اسلامی اخلاق" کا اس طرح مظاہرہ کر رہے ہیں کہ سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔

اسی پر بس نہیں، حرمین شریفین کی تقدیس کو پامال کرنے کی غرض سے انہی دیار میں جن کانفرنسوں کا اہتمام ہو رہا ہے، جن میں جی بھر کر سعودی حکومت کو گالیاں دی جاتی ہیں اور اس معاملہ میں ایران کے خونی حکمرانوں کا تعاون تک حاصل کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

یہ فرقہ دارانہ مسئلہ، اب جس حد تک سنگین شکل اختیار کر چکا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اب ریڈیو اور ٹی وی پر اس قسم کے سوالات ہونے لگے ہیں، جیسا کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۵ء کو کراچی ٹی وی سے "تفہیم دین" کے پروگرام میں پروفیسر حسنین کاظمی صاحب نے معروف صحافی صلاح الدین صاحب سے اس ضمن میں ایک سوال کیا۔

ہمارا احساس ہے اور اس احساس کو ہم چھپانا نہیں چاہتے کہ یہ مسئلہ ہمارے ہاں پیدا ہوا نہیں پیدا کیا گیا اور اس کی پیدائش اس دور میں ہوئی جب ہمارے یہاں غیر ملکی تسلط تھا، مغلیہ خاندان کی عظمت خاک میں مل چکی تھی۔ علماء، صلحاء، تاجر اور نواب، مزدور اور کسان، الغرض زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق غیرت مند اور جسور و غیور مسلمان پھانسی پر لٹکائے جا چکے تھے اور لٹکائے جا رہے تھے۔ تو شملہ کی پہاڑیوں سے شیاطینِ فرنگ نے اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِھِمْ (الانعام ۱۲۱)، کے قرآنی ارشاد کی یاد تازہ کی ہے۔ اپنی مکروہ پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" ـــــ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کچھ "اہلِ علم"، کچھ اہلِ صلاح" اور اسی طرح کے مختلف افراد کو شیشہ میں اتارا ـــــ کچھ افکار گھڑے گئے اور کچھ معتقدات بنائے گئے ـــــ پھر انہیں کچھ افراد اور جماعتوں کے کھاتے میں ڈالا گیا اور تقریر و تحریر کے ذریعہ ان کا خوب ڈھنڈورا پیٹا۔ یہ اتفاق نہیں بلکہ سوچی سمجھی سکیم تھی کہ من گھڑت افکار و معتقدات ان کے کھاتے میں ڈالے گئے جو فکری اور عملی طور پر اپنی آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے تھے۔

ـــــ پھر کیا ہوا؟ کتابیں، جوابی کتابیں، مناظرے اور مجادلے ـــــ بیسوں

صدی میں تحریکِ خلافت ایک ایسی تحریک تھی جس میں مسلمان چھوڑ غیر مسلم بھی ایک لڑی میں پروئے جا چکے تھے۔ اور محسوس ہو رہا تھا کہ انگریز کا یہاں سے بستر بوریا اٹھ جائے گا بلکہ عالمی سطح پر انگریز سامراج کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑے گی لیکن ہوا یہ کہ خلافت کی تحریک سبوتاژ ہوئی اور کچھ خانوادے اور طبقات سامنے آکر عجب عجب گل افشانیاں کرنے لگے۔ وہ دن اور آج کا دن ـــــ یہ بدقسمت قوم اسی طرح الجھاؤ اور انتشار کا شکار ہے ـــــ بعض مواقع پر ابھرنے کے مختلف الفکر رہنماؤں نے "اتحاد و اتفاق" کا مظاہرہ کیا بھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ دکھلاوا تھا، حقیقت نہ تھی ـــــ صدیوں قبل قرآن عزیز نے جو نقشہ کھینچا تھا وہ سامنے آیا۔

تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (الحشر-۱۴)

اس کا مظاہرہ ہم نے ۱۹۷۷ء کی اس عظیم الشان تحریک میں دیکھا جو نوابزادہ نصراللہ خان کے بقول خلافت کے بعد سب سے بڑی تحریک تھی، جس میں ہر طبقہ کے افراد متحد العمل تھے ـــــ لیکن اتنی بڑی تحریک ناکامی پر منتج ہوئی تو ہمارے نزدیک اس کا سب سے بڑا سبب اور عامل اس کے رہنما تھے جو "جمہوریت کی بحالی اور بنیادی حقوق کے تحفظ" کی غرض سے باہم مل کر سوچتے، اجلاس کرتے، مشاورت کرتے، لیکن اسی دوران جب احکم الحاکمین کے حضور جھکنے کا وقت آتا ادائیگی سجدہ کے لئے مسجد کا منادی پکارتا تو ان رہنمایانِ قوم میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی کہ وہ اس فریضہ سے یکسر ناآشنا اور غافل ہوتے ـــــ اور جو اس کا اہتمام کرتے وہ مسجد جانے کی زحمت گوارا نہ کرتے، بلکہ وہیں دفتر کے آنگن میں اس طرح کھڑے ہوتے کہ ایک جماعت ایک رُخ پر ہو رہی ہے تو دوسری جماعت دوسرے رُخ پر ـــــ یہ باتیں دیکھ کر ہمارا دل کڑھتا، ہم سوچتے کہ اس قوم کا کیا بنے گا۔ رہ رہ کر اس دور کے وزیرِ اعظم بھٹو مرحوم کی بات ہمارے ذہن میں گونجتی کہ ان لوگوں کا اجتماع صرف میرے سبب سے ہے۔ ورنہ یہ لوگ کبھی اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔ پھر وہی ہوا چشمِ فلک نے دیکھا کہ کراچی کے نشتر پارک میں لاکھوں انسانوں کے سامنے ہاتھ بلند کر کے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر باہم متحد رہنے کا عزم کرنے والے، چند ہی بعد اس طرح الجھے کہ الاماں ـــــ!

انگریز کے دور کے لد جانے کے بعد بھی حکومتی سطح پر اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔ حکمرانوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم نے یہ ملک اسلام کے نام پر لیا ہے اور ہماری ذمہ داریوں میں منکرات کو مٹانا شامل ہے اور یہ بات سب سے بڑا "منکر" ہے۔ بلکہ سفید انگریز کے سیاہ فام جانشینوں نے اسی "مسلکِ افرنگ" کو اپنایا۔ وہی پالیسی جاری رکھی، تاآں کہ وہ دور آ گیا، جس میں آج ہم بس رہے ہیں ـــــ بعض

لوگوں کے نزدیک اس دور کی ابتدا بڑی حسین تھی لیکن مفتی محمود قدس سرہٗ جیسے لوگ تجربہ کے بعد محسوس کرنے لگے کہ یہ سب سراب ہے ـــــ اور امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد بھی نیک توقعات کے ساتھ "مجلس شوریٰ" میں گئے لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا اور پھر ڈاکٹر صاحب نے جرأت و بے خوفی سے نہ صرف استعفیٰ دیا بلکہ ایک خط کے ذریعے حقائق کی قلعی کھول دی ـــــ کہنا یہ ہے کہ یہ دور جس میں اسلام اور اسلامی روایات کا اس قدر چرچا ہوا ـــــ اس دور میں سرکاری سطح پر جس قدر اس مسلک کی حوصلہ افزائی ہوئی وہ ایک شرمناک معاملہ ہے ـــــ کس قدر ستم ہے کہ :

یہاں شریعت کورٹ قائم ہوئی تو فرقوں کی بنیاد پر اس میں ججوں کا تقرر ہوا، پھر جب سپریم کورٹ میں شریعت اپیلیٹ بنچ قائم ہوا تو اس میں یہی روایت اپنائی گئی۔ مجلس شوریٰ میں، اسلامی نظریاتی کونسل میں، رویت ہلال کمیٹی میں، اوقاف میں، صوبائی اور ضلعی سطح پر خطباء کے تقرر میں، ریڈیو، ٹی وی کے مذہبی (!) حسن قرأت اور اس نوع کے جملہ دیگر امور میں یہی کچھ ہونے لگا۔ اس کی سب سے خوفناک شکل اب یہ سامنے آئی ہے کہ حکومت نے مدارس عربیہ کی سندات کو ایم۔ اے کے برابر تسلیم کیا (یہ الگ مسئلہ ہے کہ ان کا واقعاتی فائدہ سامنے نہیں آرہا) لیکن اس میں چار عدد تنظیموں کو حق نمائندگی بخشا گیا۔ وفاق المدارس العربیہ، تنظیم المدارس العربیہ، وفاق المدارس السلفیہ اور شیعہ تنظیم المدارس ـــــ گویا تعلیم جیسا بنیادی شعبہ جس کے ذریعہ جہالت اور تاریکی کے پردے چھٹتے ہیں، اس کو یہ رنگ دے دیا گیا ہے ـــــ فیا للعجب ویا حسرتا ! یہ وبا کینسر کی طرح پھیلی اور بلدیاتی انتخاب سے مرکزی اور صوبائی انتخابات تک میں اسکے خوفناک مظاہر خود ہم نے دیکھے ـــــ

یہ تو سرکاری معاملہ ہے خود اہل علم کا حال یہ ہے کہ ایک خاص مسئلہ میں ایک خاص فتویٰ ایک طبقہ کے ذمہ دار عالم کی طرف سے آیا، ہمیں تعجب ہوا، ایک ملاقات پر ان سے پوچھا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی، ہماری درخواست تھی کہ آپ کے اداروں اور مساجد میں اس فتویٰ کا رواج ہو جائے تو بہت سے مسائل سلجھ جائیں گے ہم آخرت کی جوابدہی کے پورے احساس کے ساتھ عرض کر رہے ہیں کہ انہوں نے ایک مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہمیں جواب دیا :۔

علوی صاحب! فتویٰ ہمارا ہے، صحیح بات وہی ہے جو فتویٰ میں ہے۔ لیکن ہو گا وہی جو اب ہو رہا ہے کہ آخر کچھ جماعتی مسائل ہوتے ہیں ۔

ہم نے یہ سنا تو سر پیٹ کر رہ گئے، ہم نے محسوس کیا کہ ہماری قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی اور ہم سوچنے لگے کہ جس قوم کے دینی اور علمی رہنماؤں کا یہ حال ہو، اس کا کیا بنے گا۔؟

زندگی میں ایک بار ایک صاحب کے بے حد اصرار و تقاضہ پر علماء کے ایک وفد کے ساتھ جنرل محمد ضیاء الحق سے ملاقات کا موقعہ ملا، اس موقعہ پر بھی اس مسئلہ کی سنگینی سامنے آئی اور ہم نے کچھ گذارشات پیش کیں جن کو بعد میں ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور جیسے وقیع دینی رسالہ میں ایک اڈیٹوریل نوٹ کے طور پر ہم نے لکھا کہ ہم اس زمانے میں اس سے وابستہ تھے ۔۔۔۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، اور اس کے بعد ہی شاہی مسجد کا وہ المیہ رونما ہوا جس میں اگر ایک طبقہ کے مخلص افراد کی قربانی نہ ہوتی تو لاہور میں یقیناً تاریخی قتل و غارت ہوتا۔ لیکن اس کے بعد بھی کسی کی آنکھیں نہ کھلیں اس وقت ملک نازک موڑ پر ہے ۔۔۔۔ حکمتِ قرآن کے صفحات اس کے متحمل نہیں کہ سیاسی مسائل اور اس ضمن میں اٹھنے والے طوفانوں پر خامہ فرسائی کی جائے ۔۔۔۔ ہم دین کے خادم، قرآن و سنّت کے طالب علم اور اسلاف کی عظیم روایات کے پابند انسان ہیں، ہمارے کانوں میں آج بھی اس صدی کے عظیم انسان اور مجدد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے وہ الفاظ گونج رہے ہیں جو انہوں نے اسارت مالٹا سے واپسی پر اپنے مخصوص خدام کو ارشاد فرمائے، جن میں قرآنی تعلیمات کو عام کرنے اور باہمی اختلافات کو مٹانے کی ضرورت پر زور دیا۔

ہم حکومت سے کیا کہیں؟ وہ اندھی بہری تو نہیں۔ اس کے ان گنت ادارے ہیں جن کے ذریعہ اسے لمحہ لمحہ کی خفیہ رپورٹیں ملتی ہیں۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ کتنا سنگین معاملہ ہے۔ اور یہ کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے

ہم نے جنرل ضیاء الحق صاحب کے منہ پر کہا، اس کے بعد مختلف حوالوں سے لکھا اور اب بھی کہتے ہیں کہ مختلف النوع سرکاری اور قومی اداروں میں فرقوں کی بنیاد پر نمائندگی کا سلسلہ یکسر ختم کیا جائے کہ یہ خوفناک کینسر ہے، بلکہ اداروں کی ضرورت کے اعتبار سے اہلیت و صلاحیت کی بنیاد پر رجالِ کار کا تقرر کیا جائے، کیونکہ ان اداروں کا مقصد قومی اور ملّی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے نہ کہ طبقات اور فرقوں کے مسائل حل کرنے ہیں ۔۔۔۔ اسی طرح ہماری دیرینہ خواہش ہے جس کا ہم اب بھی اظہار کرنا چاہیں گے اور اس پر اصرار کریں گے کہ میلاد سے لے کر سیرت تک اور اس نوع کے جملہ جلسے اور کانفرنسیں اور ان کے لئے رنگا رنگ پوسٹر اور مساجد کے لاؤڈ اسپیکر، عرس اور مذہبی میلے، نیز مدارس کے سالانہ جلسے، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن سے امّت کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو رہا ہے، تجربہ کے طور پر انہیں ۳ یا ۶ ماہ کے لئے یکسر بند کر دینا ضروری ہے

تاکہ اس کی روشنی میں نتائج کا جائزہ لیا جا سکے ـــــــ لیکن یہ بات شاید ممکن نہ ہو اس لئے کہ ان باتوں کا موجود ہونا بلکہ انہیں اضافہ و ترقی حکومتی بزرجمہروں کے مفاد میں ہے۔ جنہیں احساس نہیں کہ جب موج اٹھے گی تو کون کون ڈوبے گا ؟

اگر موج اٹھی تو ڈوبو گے سارے
نہ تم ہی بچو گے نہ ساتھی تمہارے

حکومت کے ساتھ اہلِ علم اور مختلف طبقات کے ذمہ دار افراد کو توجہ دلانا اہم فرض سمجھتے ہیں کہ

اے وارثانِ علومِ نبوت اور اے مسند نشینانِ منبر و محراب اور اے ذمہ دارانِ قوم!
آپ محسوس کریں کہ کبھی وہ دور تھا کہ اس معاشرہ پر تمہارے اتنے گہرے اثرات تھے کہ کوئی قدم تمہاری مرضی کے بغیر نہ اٹھایا جا سکتا تھا ـــــــ یہ عزت تمہیں ملی تھی دینِ اسلام کے خادم کے طور پر۔ لیکن اس دین سے بے وفائی اور اس کے بجائے اپنے حزبی اور گروہی مفادات کی پاسداری و پاسبانی کے جذبہ نے تمہیں بے وقعت کر دیا ہے۔ اللہ کے لئے سوچو، ان معاملات کو ختم کرو، قرآن و سنت کی طرف رجوع کرو۔ اس "عروہ وثقیٰ" کو مضبوطی سے تھام لو جو قرآن و سنت کی شکل میں موجود و محفوظ ہے ـــــــ دین تو حضور اقدس علیہ السلام کی زندگی میں مکمل ہو چکا تھا، نجات کے جو اسباب تھے ان کی نشان دہی ہو چکی تھی، بعد کی علمی، فکری کاوشیں اور تحریکیں بے شک ملت کا سرمایہ ہیں لیکن ایسی نہیں کہ ان کی بنیاد پر تکفیر و تفسیق اور تضلیل کی گرم بازاری ہو ـــــــ

اگر ہماری ان ناچیز گذارشات کی طرف آپ نے توجہ کر کے ان کو اپنا لیا تو آپ یقین کریں کہ آپ کا کھویا ہوا وقار اور عزت آپ کو واپس مل جائے گی۔ ورنہ ہر نیا دن اس المناکی میں اضافہ کا سبب ہو گا ـــــــ

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

●●●●●●●●●●●●

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ
تم میں بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن پڑھیں اور پڑھائیں

سلسلۂ تقاریر الٓمّٓ

سورۂ بقرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
الٓمّٓ ۝ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ۛ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ
بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝

قرآنِ حکیم کی جن ۲۹ سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے ان میں سے اب صرف دو کا ذکر باقی ہے۔ اور وہ ہیں سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران جو مصحف میں سورۂ فاتحہ کے فوراً بعد واقع ہوئی ہیں۔ جن کا آغاز ہوتا ہے حروفِ مقطعات 'الٓمّٓ' سے۔ ان کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ رائے پہلے نقل کی جا چکی ہے کہ یہ حروف قائم مقام ہیں اس جملے کے کہ "اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ (میں اللہ سب سے بڑھکر جاننے والا ہوں) واللہ اعلم!

ان دونوں سورتوں کے مابین معنوی اعتبار سے بھی اور ظاہری اعتبار سے بھی بڑی گہری مشابہتیں ہیں اور نہایت گہرا ربط ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان دونوں کو ایک نام دیا ہے "الزہراوین" دو انتہائی روشن اور تابناک سورتیں۔ اور آپؐ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ ان سورتوں کو پڑھیں گے اور ان سے محبت رکھیں گے، میدانِ حشر میں یہ سورتیں دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہونگی اور اپنے اُن چاہنے والوں، پڑھنے والوں پر سایہ کرینگی۔ سورۂ بقرہ قرآنِ حکیم کی عظیم ترین سورہ ہے۔ اسکا ایک تو ظاہری پہلو ہے یعنی کہ حجم کے اعتبار سے سب سے بڑی سورۃ ہے جو مصحف کے تقریباً ڈھائی پاروں پر محیط ہے۔ ۲۸۶ آیات اور ۴۰ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اور ایک اس کی عظمت کا معنوی پہلو ہے۔ جس کی طرف اشارہ فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس قولِ مبارک میں۔ لِکُلِّ شَیْءٍ سَنَامٌ وَسَنَامُ الْقُرْاٰنِ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ

یعنی ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے ہر چیز کا ایک نقطۂ عروج اور نقطۂ کمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی چوٹی (CLIMAX) یعنی اس کا نقطۂ عروج سورۂ بقرہ ہے۔ مضامین کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کو سورۃ الاُمتین قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی دو اُمتوں کی سورہ۔ ایسے کہ اس کے تقریباً دو مساوی حصے قرار دیئے جا سکتے ہیں پہلے حصہ میں اکثر و بیشتر خطاب کا رخ یا روئے سخن سابقہ اُمت مسلم یعنی بنی اسرائیل کی جانب ہے اور دوسرے حصے میں خطاب ہے براہِ راست اُمت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بحیثیت اُمت مسلم۔ یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ بنی اسرائیل سابقہ امت مسلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑا انعام و اکرام کیا۔ رسالت کا سلسلہ ان میں جاری رہا۔ شریعت ان کو عطا ہوئی۔ تورات، زبور اور انجیل جیسی کتابیں ان کو عطا فرمائی گئیں۔ تقریباً ۲ ہزار برس تک یہ امت روئے ارضی پر اللہ کی نمائندہ اُمت رہی۔ اس کی شریعت و ہدایت کی حامل لیکن اپنے اخلاقی، علمی اور اعتقادی زوال کے باعث اور اضمحلال کے سبب سے بالآخر اللہ تعالیٰ نے اِس اُمت کو اُس مقام اور مرتبے سے معزول فرما دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت کی بنیاد پر ایک نئی اُمت کی تاسیس فرمائی۔ یہ نئی اُمت دراصل اُمتِ محمدؐ ہے، جو اب موجودہ اُمت مسلم ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور اس امت کو اب اس مقام پر فائز فرمایا گیا جس مقام پر اس سے پہلے بنی اسرائیل فائز تھے۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جو اڑھائی رکوعوں پر مشتمل ہے اور جس میں ۱۵۲ آیات ہیں۔ اسمیں خطاب یا تو براہ راست ہے بنی اسرائیل سے چنانچہ دس رکوع جو درمیانی ہیں ان میں یہ خطاب براہِ راست ہے نام لیکر یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ اور یا روئے سخن ان کی جانب ہے یعنی بالواسطہ خطاب ہے چنانچہ ابتدائی چار رکوعوں میں پہلے ۲ میں تین قسم کے انسانوں کا ذکر کیا گیا۔ ایک وہ لوگ جو قرآن مجید کی ہدایت سے کما حقہ، استفادہ کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو انکار اور کفر پر اڑ گئے تھے اور تیسرے وہ تھے جو بین بین تھے زبان سے تو مدعی تھے ایمان کے حقیقتاً مانے والے نہیں تھے۔ یہ تیسرا کردار زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے لایا گیا اس لیے کہ یہ راست آتا ہے منافقین پر بھی اور یہود پر بھی۔ پھر دو رکوعوں میں قرآن مجید کی اساسی دعوت اور اسکا بنیادی فلسفہ اور اس کی اساسی حکمت بیان ہوئی ہے۔ جو قرآن مجید میں مکی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔ یہاں ان کا ایک لب لباب اور ایک خلاصہ دے دیا گیا تاکہ یہ آئندہ کے مباحث کے لیے ایک جامع تمہید بن جائے۔

پھر خطاب شروع ہوا بنی اسرائیل سے پانچویں رکوع میں خطاب شروع ہوا بنی اسرائیل سے بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کو دعوت دی گئی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ۝ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ ص وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ۝

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی، اور پورا کرو میرا عہد تاکہ میں پورا کروں تمہارے عہد کو اور مجھ ہی سے ڈرو میرے سوا کسی اور سے خوف نہ کھاؤ، اور ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے جو تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے۔ اور دیکھنا کہیں تم بھی اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بن جانا۔ اور صرف میرا تقویٰ اختیار کرو۔"

یہ ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور قرآن مجید پر ایمان کی نہایت پرزور دعوت۔ چھٹے رکوع سے اب بیان شروع ہوتا ہے جسے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مفصل فردِ قرار دادِ جرم ہے جو بنی اسرائیل پر عائد کی گئی کہ تمہارے یہ یہ کرتوت ہیں، اور تمہاری یہ وہ اخلاقی زوال کی نشانیاں ہیں، تمہاری یہ اعتقادی گمراہیاں ہیں کہ جنکے سبب سے اب تم اسکے اہل نہیں رہے کہ اس منصب پر تمہیں برقرار رکھا جائے جس پر کہ تم دو ہزار برس تک فائز رہے ہو۔ اس کے بعد پندرھویں سے لیکر اٹھارھویں رکوع تک یعنی چار رکوعوں میں خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے یہ چار رکوع تحویلی ہیں یعنی جن میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا ہے اور یہ تحویلِ قبلہ علامت (SYMBOL) ہے اس بات کی کہ اب وہ سابقہ قبلے والی قوم معزول کر دی گئی۔

جن کا مرکز بیت المقدس تھا اب وہ اس منصب سے معزول کر دیئے گئے اور اب بیت اللہ کے گرد اس کی بنیاد پر بنی اسماعیل میں سے ایک نئی امت کا آغاز ہو رہا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی بنیاد پر اور اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اہلِ توحید کا قبلہ رہے گا۔ ان رکوعوں میں وہ عظیم آیت بھی وارد ہوئی ہے جس میں امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس بیان ہوئی۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔

یعنی ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے ہر چیز کا ایک نقطۂ عروج اور نقطۂ کمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی چوٹی (CLIMAX) یعنی اس کا نقطۂ عروج سورۂ بقرہ ہے۔ مضامین کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کو سورۃ الامتین قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی دو امتوں کی سورہ۔ اسلیے کہ اس کے تقریباً دو مساوی حصے قرار دیئے جا سکتے ہیں پہلے حصہ میں اکثر و بیشتر خطاب کا رخ یا روئے سخن سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی جانب ہے اور دوسرے حصے میں خطاب ہے براہِ راست امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بحیثیت اُمتِ مسلمہ۔ یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ بنی اسرائیل سابقہ امت مسلمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑا انعام و اکرام کیا۔ رسالت کا سلسلہ ان میں جاری رہا۔ شریعت ان کو عطا ہوئی۔ تورات، زبور اور انجیل جیسی کتابیں ان کو عطا فرمائی گئیں۔ تقریباً ۲ ہزار برس تک یہ امت روئے ارضی پر اللہ کی نمائندہ اُمت رہی۔ اس کی شریعت و ہدایت کی حامل لیکن اپنے اخلاقی، علمی اور اعتقادی زوال کے باعث اور اضمحلال کے سبب سے بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو اُس مقام اور مرتبے سے معزول فرما دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی بنیاد پر ایک نئی اُمت کی تاسیس فرمائی۔ یہ نئی اُمت دراصل اُمتِ محمدؐ ہے، جو اب موجودہ امت مسلمہ ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور اس امت کو اب اس مقام پر فائز فرمایا گیا جس مقام پر اس سے پہلے بنی اسرائیل فائز تھے۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جو اٹھارہ رکوعوں پر مشتمل ہے اور جس میں ۱۵۲ آیات ہیں۔ اسمیں خطاب یا تو براہ راست ہے بنی اسرائیل سے چنانچہ دس رکوع جو درمیانی ہیں ان میں یہ خطاب براہِ راست ہے نام لیکر یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ اور یا روئے سخن ان کی جانب ہے یعنی بالواسطہ خطاب ہے چنانچہ ابتدائی چار رکوعوں میں پہلے ۲ میں تین قسم کے انسانوں کا ذکر کیا گیا۔ ایک وہ لوگ جو قرآن مجید کی ہدایت سے کما حقہ، استفادہ کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو انکار اور کفر پر اڑے گئے تھے اور تیسرے وہ تھے جو بین بین تھے زبان سے تو مدعی تھے ایمان کے حقیقتاً مانے والے نہیں تھے۔ یہ تیسرا کردار زیادہ تفصیل کے ساتھ سامنے لایا گیا اس لیے کہ یہ راست آتا ہے منافقین پر بھی اور یہود پر بھی۔ پھر دو رکوعوں میں قرآن مجید کی اساسی دعوت اور اسکا بنیادی فلسفہ اور اس کی اساسی حکمت بیان ہوئی ہے۔ جو قرآن مجید میں مکی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ آچکی ہے۔ یہاں ان کا ایک لب لباب اور ایک خلاصہ دے دیا گیا تاکہ یہ آئندہ کے مباحث کے لیے ایک جامع تمہید بن جائے۔

پھر خطاب شروع ہوا بنی اسرائیل سے پانچویں رکوع میں خطاب شروع ہوا بنی اسرائیل سے بڑی دلسوزی کے ساتھ اس کو دعوت دی گئی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ۝ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ وَلَا تَکُوْنُوْٓا اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۪ وَّاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ۝

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی، اور پورا کرو میرا عہد تاکہ میں پورا کروں تمہارے عہد کو اور مجھ ہی سے ڈرو میرے سوا کسی اور سے خوف نہ کھاؤ۔ اور ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا ہے جو تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے۔ اور دیکھنا کہیں تم بھی اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بن جانا۔ اور صرف میرا تقویٰ اختیار کرو۔"

یہ ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور قرآن مجید پر ایمان کی نہایت پرزور دعوت۔ چھٹے رکوع سے اب بیان شروع ہوتا ہے جسے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک مفصل فردِ قرارداد جرم ہے جو بنی اسرائیل پر عائد کی گئی کہ تمہارے یہ یہ کرتوت ہیں، اور تمہاری یہ وہ اخلاقی زوال کی نشانیاں ہیں، تمہاری یہ اعتقادی گمراہیاں ہیں کہ جنکے سبب سے اب تم اسکے اہل نہیں رہے کہ اس منصب پر تمہیں برقرار رکھا جائے جس پر کہ تم دو ہزار برس تک فائز رہے ہو۔ اس کے بعد پندرھویں سے لیکر اٹھارھویں رکوع تک یعنی چار رکوعوں میں خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے یہ چار رکوع تحویلی ہیں یعنی جن میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا ہے اور یہ تحویلِ قبلہ علامت (SYMBOL) ہے اس بات کی کہ اب وہ سابقہ قبلے والی قوم معزول کر دی گئی۔

جن کا مرکز بیت المقدس تھا اب وہ اس منصب سے معزول کر دیئے گئے اور اب بیت اللہ کے گرد اس کی بنیاد پر بنی اسماعیل میں سے ایک نئی امت کا آغاز ہو رہا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی بنیاد پر اور اب یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اہلِ توحید کا قبلہ رہے گا۔ ان رکوعوں میں وہ عظیم آیت بھی وارد ہوئی ہے جس میں امتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس بیان ہوئی۔

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا۔

مسلمانو! ہم نے تمہیں ایک بہترین امت "امت وسط" اس لیے بنایا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم پر گواہ ہو جائیں۔"

یعنی یہ حق کی گواہی دیں تم پر، توحید باری تعالیٰ اور اپنی نبوت کی گواہی دیں تم پر اور تم یہی گواہی دو پوری دنیا کے سامنے۔ یہ حجت قائم کر دیں تم پر اور تم حجت قائم کرو پوری نوع انسانی پر۔ اس لیے کہ ہمارے اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے اب اور کوئی نبی یا رسول آنے والا نہیں، رسولوں اور نبیوں کی ذمہ داریاں اے امت محمدؐ اب بحیثیت مجموعی تمہارے کاندھوں پر آگئی ہیں۔ شہادت علی الناس، خلق خدا پر اتمام حجت، خلق خدا کو توحید باری تعالیٰ اور بندگیٔ رب کی دعوت اور صراط مستقیم کی ہدایت دینا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس آیت سے متصلاً قبل اور معاً بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اس کے قبول کا اعلان ہے اور اس کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ کار بیان ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

اٹھارہویں رکوع میں اعلان ہوا کہ اسی دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا ظہور ہے بعثت محمدی کی شکل میں ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

یہ چار اصطلاحات بڑی اہم ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ کار انہی چار میں سامنے آتا ہے۔ اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا لوگوں کا تزکیہ کرنا انکی اخلاقی اصلاح کرنا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔ یہ ہے انقلاب محمدیؐ کا اساسی منہاج۔

۱۹ ویں رکوع سے اب شروع ہوتا ہے خطاب امت مسلمہ سے چنانچہ ابتداء ہی میں ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ایک بڑی نازک ذمہ داری تمہارے کندھوں پر آگئی ہے۔ یہ ایک بڑا بھاری بوجھ ہے۔ یہ پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں بھرا بستر ہے لہذا پہلی بات یہ فرمائی گئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

"اے اہل ایمان نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ صبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے"!

اسکے بعد ارشاد ہوتا ہے اب کمربستہ ہو جاؤ اب تمہارے ایمان اور یقین کے امتحانات آنے والے ہیں یہ نہ سمجھنا کہ ہجرت کے بعد مدینے میں تمہیں گوشۂ عافیت مل گیا ہے۔

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۝

ابھی تو ہم بھوک سے جان و مال کے نقصان سے اور طرح طرح کی تکلیفوں سے تمہیں آزمائیں گے — اس سے آگے ۲۲ رکوعوں میں دو مضامین کی لڑیاں ہیں جو باہم پیوست چلی گئی ہیں گتھی ہوئی، ایک میں یہ مقصد عظیم، یہ ذمہ داری، یہ فرض منصبی جو امت کے کندھوں پر آئی اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ، قتال فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب اور تشریح ہے۔ اور دوسری لڑی مشتمل ہے شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ابتدائی خاکہ پر جو اس سورۂ بقرہ کے اندر تیار ہو گیا ہے، اس لیے کہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اب مسلمانوں کا ایک آزاد معاشرہ قائم ہو گیا تھا جہاں وہ اپنی حکومت سے اپنے معاملات اپنی مرضی سے طے کر سکتے تھے۔ لہٰذا ابتدائی احکام دیئے گئے کھانے پینے کی حلت و حرمت، وصیت کا قانون، قانون قصاص، روزے کی فرضیت، حج کے احکام، شادی بیاہ اور طلاق کے احکام۔ یہ تمام احکام جن سے شریعت کا ابتدائی ڈھانچہ تیار ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں آگئے ہیں۔

اور اسی کے بین بین کچھ عظیم آیات حکمت و معرفت کے بڑے عظیم خزانے ہیں جو گویا نگینوں کی طرح جڑ دیئے گئے ہیں انہی میں آیت البر ہے جس میں نیکی کی حقیقت کا بیان ہے، آیۃ الکرسی ہے کہ جس میں توحید کا بیان ہے نہایت جامعیت کے ساتھ اور آخیر میں وہ دو آیتیں جن کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ خاص عرش باری تعالیٰ کے نیچے کے خزانوں میں سے دو خزانے ہیں جو حضور کو شب معراج میں امت کے لیے بطور تحفہ عطا ہوئے تھے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ۔

اور اس کے بعد آتی ہے ایک عظیم دعا:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہمارا مؤاخذہ نہ فرمائیے! اے ہمارے پروردگار اور ہم پر ایسا بوجھ مت رکھ جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر رکھا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے وہ چیز نہ اٹھوائیے جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمیں معاف کیجئے اور ہم کو بخش دیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے۔ آپ ہمارے مولیٰ ہیں پس کفار کی قوم پر ہماری مدد فرمائیے۔ آمین یا رب العالمین!

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم،
ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

❁❁❁❁❁❁❁❁

بقیہ: قرآن اور رمضان المبارک کا ربط و تعلق

ہم نے اسے مضبوطی سے نہیں تھاما۔ گمراہ ہوئے، ذلیل ہوئے، خوار ہوئے۔ بقول اقبالؒ ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ

وہ کتاب زندہ ہمارے پاس موجود ہے، اس کی طرف رجوع کیجئے! اس کی طرف توجہ دیجئے! اس کو پڑھیے! اس کو سمجھیے! اس پر عمل کیجئے اور ہر مسلمان اس کا پرچارک بن جائے۔ مبلغ بن جائے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً۔ "پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت پہنچاؤ"۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم۔

(دوسری قسط)

قرآن اور رمضان المبارک کا ربط و تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

لیکن انسانوں کے لیے جب یہ کلام نازل کیا گیا ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ ان کے لیے اس کلام ربّانی میں افادیت کے پہلو کون کون سے ہیں! ایک شئے اپنی جگہ پر بہت عظیم ہے لیکن فرض کیجئے کہ مجھے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو رہا تو وہ اپنی جگہ عظیم ہوا کرے ــ لیکن یہاں قرآن حکیم افادیت کے چند اہم پہلو بیان کرتا ہے :

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝

"اے لوگو! تمہارے پاس وہ 'شئے' آگئی ہے"۔ اب آگے اس شئے کی افادیت کے اعتبار سے چار الفاظ استعمال کیے گئے۔ پہلا یہ کہ "وہ موعظہ ہے نصیحت ہے"۔

(میں ابھی عرض کروں گا کہ ان چاروں الفاظ کے مابین ربط کیا ہے ۔! جو یہاں بیان ہوئے ہیں۔) دوسرا یہ کہ "وہ شفاءٌ لما فی الصدور ہے"۔ سینوں کے اندر جو روگ ہیں وہ انکا مداوا ہے، ان کی دوا ہے، ان کا علاج اور ان کے لیے شفا ہے ــ تیسرا یہ کہ "ھدیٰ ہے، ہدایت ہے"۔ میں نے سورۂ بقرہ کی جو آیت آپ کو رمضان سے متعلق سنائی تھی اس میں اس ہدایت کے لیے تین الفاظ آئے ہیں: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ وہاں ہدایت کو تین پہلوؤں سے بیان کیا گیا ۔ یہاں زیادہ جامع مضمون ہے لہذا ھُدٰی (ہدایت) کا ایک لفظ آیا۔ اور چوتھا یہ کہ: "وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ"۔ اور وہ اہل ایمان کے حق میں رحمت ہے۔

پہلے تو ان چار الفاظ اور ان چار چیزوں کو سمجھئے۔ دیکھئے اگر ہم میں سے کسی شخص کی طبیعت میں نیکی اور خیر کی طرف کوئی جذبہ ابھرے، کوئی داعیہ بیدار ہو، اُسے سب سے پہلا احساس یہ ہوگا کہ اس کے دل میں کچھ سختی سی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ دل کے اوپر کچھ خول سا آگیا ہے ۔ کوئی CRUST ہے ۔ یہ چیزیں درحقیقت

نیکی اور خیر کی طرف پیش قدمی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر کسی شخص کا معدہ خراب ہے، اس کی انتڑیوں میں جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اسے آپ اعلیٰ سے اعلیٰ دوائیاں بھی دیدیں اور وہ جذب ہی نہ ہو رہی ہوں تو فائدہ کیسے کریں گی! وہ تو جب خون میں داخل ہوں، خون میں جذب ہوں تو ان سے افاقہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کوئی اور طریقہ اختیار کرتے ہیں اور طے کرتے ہیں

کہ اُسے انجکشن لگوائے جائیں۔ اس لیے کہ معدہ تو جذب نہیں کر رہا۔ لہٰذا کسی اور راستہ سے دوا اندر پہنچائیں۔ تو پہلی بات یہ سمجھیے کہ دل میں اگر سختی آچکی ہے تو کوئی شے اُس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ اُس میں جذب نہیں ہوگی۔ پہلی ضرورت یہ ہوگی کہ دل پر جو خول، جو CRUST آگیا ہے، اُس میں نرمی پیدا کی جائے۔ اس میں گداز ہو، اس میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اب اس دل کی سختی کا معاملہ بھی میں آپ کے سامنے رکھ دوں۔ قرآن مجید میں دو مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے خاص طور پر مذہبی طبقات کے دلوں میں جو سختی اور قساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُسے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں یہود اور خاص طور پر ان کے علماء کے دلوں کی سختی کا ذکر بایں طور کیا گیا کہ: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ "پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد وہ پتھروں کے مانند ہو گئے بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ گئے"۔ آیت کے اگلے حصے میں اس مضمون کو مزید واضح کیا گیا کہ "پتھروں میں تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو شق ہو جاتے ہیں یعنی پھٹ جاتے ہیں تو ان میں سے پانی برآمد ہو جاتا ہے (یعنی چشمہ پھوٹ بہتا ہے) اور پتھروں میں وہ بھی ہوتے ہیں جو گر جاتے ہیں اللہ کے خوف اور خشیت سے"۔ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ ______

لیکن انسان کا دل جب سخت ہوتا ہے تو اس کی سختی کا مقابلہ اس کائنات کی کوئی شے نہیں کر سکتی۔[۱] یہی بات سورہ حدید میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمائی گئی کہ مسلمانو! وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ "اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی لیکن جب ایک طویل مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور اسی باعث ان کی اکثریت فساق و فجار پر مشتمل ہے"۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب نہ ہو۔ کتاب موجود تھی وہ اس کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے۔ ان کو مخاطب کر کے متعدد مقامات پر فرمایا گیا ہے: وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ "تم کتاب پڑھا کرتے ہو" یعنی تمہارے پاس کتاب موجود

[۱] برصغیر پاک و ہند میں فرقہ وارانہ، مسلکی، علاقائی، لسانی فسادات کے مواقع پر جو کچھ ہوتا رہتا ہے وہ اس بات پر شاہد ہے کہ جب انسانوں کے دل سخت ہو جاتے ہیں تو وہ بربریت میں وحشی درندوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔

ہے۔ اگرچہ اس کے اندر کچھ تحریف ہوگئی تھی۔ اگرچہ اس میں تھوڑا بہت تغیر و تبدل بھی ہوگیا تھا۔ بایں ہمہ کتاب کا جتنا صحیح حصہ ان کے پاس تھا، اس سے بھی وہ فائدہ نہیں اٹھا رہے تھے۔ ایسا کیوں ہوگیا؟ یہ دل کی سختی ہے۔ تو سب سے پہلے کرنے کا کام کیا ہے؟ اب آپ غور کیجئے۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں جھانکے اپنے دل کو ٹٹولے کہ کہیں اس میں سختی تو نہیں!۔۔۔

اس موقع پر ایک بات یہ بھی عرض کر دوں کہ اس کا معاملہ انسان کے احساس سے بھی ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کے سینہ میں پتھر ہو اور آپ کو پتہ تک نہ ہو۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ذرا سی سختی آئی ہو اور آپ پریشان ہو جائیں۔ یہ ہے انسان کے اپنے احساس اور حس کی بیداری کا معاملہ۔۔۔ چنانچہ منافق کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفاق وہ مرض ہے کہ: مَا اٰمنہ الا منافقٌ وَمَا خافَہٗ اِلّا مُؤمنٌ۔" اس سے اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھتا ہے صرف منافق! اور اپنے بارے میں اس کا اندیشہ اور خوف رکھتا ہے صرف مومن!۔۔۔ مومن کو ڈر لگا رہتا ہے کہ ایمان کی جو تھوڑی بہت پونجی میرے پاس ہے، کہیں وہ ہاتھ سے چلی نہ جائے۔ جس کے پاس ایمان کی رمق بھی موجود نہیں۔ اُسے کہاں کا اندیشہ! بقول غالب۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو۔ جب ساری دولت چلی گئی تو اب کوئی مجھ پر کیا ڈاکہ ڈالے گا! لہٰذا پاؤں پھیلا کر سوتا ہوں۔ تو جس کے پاس ایمان نہیں ہے وہ تو بے فکر ہو جاتا ہے۔ جس کے پاس ایمان کی پونجی ہے وہ ڈرتا رہتا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایک مومن سے اگر کبھی گناہ کا صدور ہو جاتا ہے، تو وہ ایسے محسوس کرتا ہے جیسے پہاڑ تلے آگیا ہے"۔ اتنا بوجھ اس کے احساس پر ہوتا ہے کہ میں یہ کیا کر بیٹھا!۔ اور ایک منافق جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُسے بھی تھوڑا سا محسوس تو ہوتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی پیاری مثال دی ہے کہ "اُسے بس اتنا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی کی ناک پر مکھی بیٹھ گئی تھی اُسے اس نے اڑا دیا"۔۔۔ اپنی اپنی باطنی کیفیات کے اعتبار سے یہ احساسات کا فرق ہے ۔۔۔ اسی سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا تھا جس کے لیے میں نے یہ تمہید اٹھائی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک وفد باہر سے آیا تھا۔ اس وفد کے سامنے قرآن پڑھا گیا۔ قرآن ان کے دل پر جاکر تیر کی طرح ایسے لگا ہے کہ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔۔۔ یعنی وہ کیفیت ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں سورۃ مائدہ میں کھینچا گیا: وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۔ "اور جب سنتے ہیں اُس کو جو نازل ہوا رسول پر تو تم ان کی آنکھوں کو دیکھو کہ ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس

وجہ سے کہ انہوں نے حق بات کو پہچان لیا"۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب وفد کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا: "هٰكَذَا كُنَّا حَتّٰى قَسَتِ الْقُلُوْبُ" "ہمارا حال بھی کبھی یہی ہوتا تھا یہاں تک کہ ہمارے دل سخت ہو گئے"۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ وہ کیا سختی ہو گی! اس پر ہم میں سے کروڑوں کے دلوں کی نرمیاں قربان ہو جائیں ہمارا قلبی سوز و گداز، بلکہ پوری اُمت کا سوز و گداز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس کیفیت پر قربان کر دیا جائے تو بھی اُن کی قلبی کیفیت افضل رہے گی۔ لیکن یہ بات جو حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمائی یہ احساس کی شدت کا معاملہ ہے۔

بہر حال پہلا کام یہ ہے کہ دلوں پر جو خول یا غلاف (CRUST) آ گیا ہے، اس کو توڑا جائے۔ اسی لیے قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلا لفظ استعمال فرمایا موعظہ۔ نصیحت اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں گداز پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ وہ بات جو دل میں جا کر تیر کی طرح پیوست ہو جائے اور انسان کی طبیعت میں وہ کیفیات پیدا کر دے کہ اس کے دل میں نرمی آ جائے۔ جب یہ صورتحال پیدا ہو گی۔ اب قرآن دل کے اندر جذب ہو جائے گا اور سرائت کر جائے گا۔ اور نتیجۃً قلب کے جملہ امراض کے لیے شفا بن جائے گا۔ اسی لیے قرآن کا افادیت کے پہلو سے یہاں دوسرا وصف بیان فرمایا: وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ معدہ کی اصلاح ہو جائے تو دوا خون میں جذب ہوتی ہے اور خون پورے وجود میں سرائت کرتا ہے اور جہاں جہاں کوئی INFECTION ہے، کوئی خرابی ہے، اس کا ازالہ کرے گا۔ اسی طرح کا معاملہ قلب کا ہے۔ یہ قلب جس طرح دورانِ خون کا مرکز ہے اسی طریقہ سے یہ قلب ہماری نفسیاتی کیفیات اور ہماری روح کا مرکز و مسکن ہے۔ اگر اس قلب کے اندر قرآن مجید کے انوار جذب ہو جائیں۔ یہ قلب تجلیاتِ قرآن سے منور ہو جائے تو یہ کیفیت وہ ہو گی۔ جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا: "اَلَا فِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ" "لوگو! آگاہ ہو جاؤ۔ تمہارے جسم میں ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو پورا وجود درست ہو جائے گا اگر اس میں فساد ہے، اس میں خرابی ہے، اس میں روگ ہے تو پورے وجود میں وہ روگ سرائت کر جائے گا۔ اور آگاہ رہو وہ لوتھڑا قلب ہے"۔ — اب سوال یہ ہے کہ یہ نفسیاتی اور قلبی روگ کون سے ہیں! یہ میں انجائنا کی اور تھرومبوسس اور ان عوارضِ قلب کی بات نہیں کر رہا جن کے متعلق ہم روز سنا کرتے ہیں کہ کل فلاں کا ہارٹ فیل ہو گیا اور آج فلاں کا — اور فلاں فلاں حضرات دل کے By Pass یا علاج کے لیے امریکہ یا یورپ جا رہے ہیں۔ یہ جو روگ ہیں یہ سب طبعی (PHYSICAL) نوعیت کے امراض ہیں۔ جن کے علاج و معالجہ سے خون کو

پمپ کرنے والا حصہ درست ہوتا ہے۔ لیکن اس قلب میں وہ روگ اور وہ امراض و عوارض کون سے ہیں جن کی طرف قرآن مجید اور احادیث شریف میں اشارہ کیا گیا ہے! وہ حُبِّ دنیا ہے: کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ اور بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وہ حُبِّ مال ہے (وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ) وہ حبِ شہرت ہے۔ وہ حبِ حشمت و وجاہت ہے۔ وہ حبِ اقتدار ہے۔ وہ حبِ شہوات و لذات ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے اس دنیا کو جہنم کا نمونہ بنا دیا ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ۔ بر و بحر میں جو مستقل فساد رونما نظر آتا ہے وہ انسانوں کے انہی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ وہ Thrombosis (دماغ میں انجمادِ خون) اور Heart Failure سے رونما نہیں ہوتا یہ امراض تو موت کے لیے بہانہ ہوتے ہیں جس کا بھی آخری وقت آتا ہے وہ چلتا بنتا ہے: وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا۔ ان عوارض سے بچ جائے گا تو اجلِ معین پر کسی اور سبب سے اس دنیا کو خیرباد کہنا پڑے گا لیکن وہ اصل اعمال و افعال جنہوں نے اس دنیا کو جہنم کا نمونہ بنایا ہے وہ حرص ہے، ہوس ہے، دولت کی بے پناہ چاہت اور تمنا ہے: اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ دولت کی وہ حرص کہ بڑے میاں نے بقا سر ٹانگیں قبر میں لٹکائی ہوئی ہیں لیکن دولت کی حرص ختم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اتنی دولت موجود ہے کہ کئی کئی پشتیں آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ اس کے باوجود حرام، حلال، جائز، ناجائز بغرض یہ کہ ہر طریقے سے وہ دولت بڑھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر حسد ہے، عُجب ہے، تکبر ہے، انانیت ہے، غیظ و غضب ہے۔ یہ ریا ہے قلب کے یہ وہ امراض ہیں جو نیکیوں کو اس طرح چٹ کر جاتے ہیں جیسے دیمک لکڑی کو۔ یہ ہیں قلب کے اصل امراض جن میں دنیا مبتلا ہے۔

اللہ تعالیٰ بچائے، اور اپنی پناہ میں رکھے اگر کہیں یہ امراض دینی طبقہ میں نفوذ کر جائیں تو پھر اس کا کوئی تریاق ہے ہی نہیں۔ یہود و نصاریٰ کے علم کو قرآن نے کبھی چیلنج نہیں کیا۔ قرآن نے تو یہ کہا ہے: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (مراد ہیں یہود و نصاریٰ) وہ ہمارے رسولؐ اور قرآن کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں"۔ کیا ان کی علمی استعداد ختم ہو گئی تھی! کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تورات اور انجیل میں کیا پیشین گوئیاں ہیں!! لیکن اس پوری علمی استعداد کی نفی کر دینے والی شے تھی دولت کی محبت، مال کی محبت، حیاتِ دنیا کی محبت: وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَیٰوةٍ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا۔ ان اہلِ کتاب کو دولت اور دنیا کی محبت میں تم مشرکوں سے کسی طرح کم نہیں پاؤ گے بلکہ یہ اس معاملے میں ان سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ۔ ان میں سے ہر

ایک کی خواہش یہ ہے کہ اُس کی عُمر ہزار برس کی ہو جائے۔ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ اور ان کی یہ طویل عمری بھی ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والی نہیں ہے۔ حُبِّ دنیا اور حبِّ مال و وجاہت کے ساتھ حق کو قبول کرنے میں ایک بڑی دوسری رکاوٹ ان اہلِ کتاب بالخصوص یہود کا حسد تھا۔ وہ اس غیظ و غضب میں جل بھن رہے تھے کہ آخری نبوت و رسالت کا تاج بنی اسمٰعیل کے ایک چشم و چراغ کو کیوں پہنا دیا گیا! ۔ یہ منصبِ جلیل محمد کو کیوں مل گیا (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں اصل میں قلب کے روگ۔ ظاہر بات ہے کہ جس کی جتنی اہمیت ہوگی اسی اعتبار سے اس کے اثرات معاشرہ پر مترتب ہوں گے۔ ایک بے چارا عام آدمی جو کسی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی دو وقت کی روٹی کمانے میں لگا ہوا ہے۔ اس میں یہ روگ ہوں گے بھی تو ان کے اثرات اس کی ذات تک محدود رہیں گے۔ لیکن اگر یہ روگ لیڈروں میں ہوں، اگر یہ بیماریاں اُن حضرات میں پرورش پا رہی ہوں جو دینی اعتبار سے سربرآوردہ ہوں تو یہ متعدی بنتی ہیں۔ یہ وبائی شکل اختیار کرتی ہیں۔ اس لیے کہ جن سے خیر کی توقع ہو ان میں یہ خرابیاں آجائیں تو صورت یہ ہوگی کہ اگر نمک اپنی نمکینی کھو دے تو پھر نمکینی کہاں سے حاصل کی جائے گی؟ یہ ہے وہ چیز جس کی خبر دی تھی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمانو! لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ: "اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے دور سے بھی سابقہ پڑے گا کہ: لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ۔ "اسلام میں سے باقی نہیں بچے گا سوائے نام کے"۔ دیکھ لیجئے ہماری زبانوں پر "اسلام زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے ہیں لیکن ہماری انفرادی زندگی میں اسلام خالی خالی نظر آئے گا اور اجتماعی زندگی تو اس سے یکسر خالی ہے۔ وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ۔ "اور قرآن میں سے باقی نہیں بچے گا مگر حروف کا رسم الخط"۔ یعنی حروف و الفاظ تو تا قیامِ قیامت محفوظ رہیں گے چونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ لیکن اس کی کما حقہ تلاوت، اس پر غور و تدبر، اس کے اوامر و نواہی پر عمل اور ان کا اجرا، اس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت اور اس کی تبلیغ یہ کام باقی نہیں رہیں گے۔ رہے بھی تو برائے نام آگے حضورؐ فرماتے ہیں: وَمَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَّهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى۔ "ان کی مسجدیں آباد بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی (رباطن) ویران و خراب"۔ اس حدیث میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے 'خراب'۔ ہم عام بول چال میں "خانہ خراب" بولتے ہیں جس کا مفہوم ہوتا ہے کہ امن و سکون اور اطمینان رخصت ہوا۔ اسی لفظ سے بابِ تفعیل سے لفظ 'تخریب' بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں، خرابی و ویرانی پیدا کرنا۔ توڑ پھوڑ کرنا۔ بدامنی پھیلانا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک خاص گروہ کی جانب سے دوسرے مسلک کی مسجدوں پر زبردستی اور بزورِ قبضہ کرنے کے لیے یہی سب کچھ ہو

رہا ہے۔ برطانیہ میں تو باقاعدہ خون ریز فسادات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے کئی مسجدوں کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ دنگا فساد رُک سکے ۔۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مسجدیں ہوں گی بڑی عالیشان، بہت اُونچی، تعمیر کا اعلیٰ نمونہ Well Furnished ۔ قالین بچھے ہوئے ۔ ائیرکنڈیشن لگے ہوئے۔ آباد بھی ہونگیں۔ لوگ بکثرت آیا کریں گے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى۔ اور اب آگے حضورؐ کا وہ ارشاد آ رہا ہے جو دلوں کے روگوں سے متعلق ہے خاص طور پر جب وہ علماء و فضلاء کے طبقے کی اکثریت میں پیدا ہو جائیں : عُلَمَآءُ هُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ۔ " آسمان کی چھت کے نیچے ان کے علماء بدترین لوگ ہوں گے۔ انہی علماء کی طرف سے فتنہ برآمد ہوگا اور انہی میں لوٹ جائے گا" یہاں مراد ہیں علماء سوء، چونکہ ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اُمّتِ مرحومہ کسی دور میں بھی علماءِ حق اور علماءِ ربّانی سے خالی نہیں رہے گی چاہے وہ معدودے چند ہوں ۔۔ ان علماءِ سُوء کا کام ہوگا. فتنہ پردازی، تفرقہ بازی مسلمانوں کو مرا و ، ان کو آپس میں لڑاؤ ۔۔ نئی نئی چیزیں ایجاد کرو ، نئے نئے شعائر کا پرچار کرو، اپنی علاحدہ علاحدہ علامتیں متعین کرو تاکہ ہماری سیادتیں اور چودھراہٹیں قائم رہیں ۔۔ یہ ہے معاملہ دلوں کے روگوں کا :

قرآن کی عظمت کی افادیت والا دوسرا پہلو یہ ہے، کہ یہ امراض کا مداوا اور ازالہ بنے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دل نرم ہو چکے ہوں ورنہ قرآن ایسے گزر جائے گا جیسے چکنے گھڑے پر پانی پڑتا ہے اور بہہ جاتا ہے، جذب نہیں ہوتا۔ جب تک کہ دل کے اندر گداز نہ ہوگا، قرآن مجید کا فائدہ نہیں ہوگا۔۔ آپ غور کیجئے کہ مشرکین مکہ کو قرآن سنانے والے کون! محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ لیکن کیا ابوجہل پر اثر ہوا؟ چلیئے وہ تو دوسرے خاندان سے تھا۔ ابولہب کون تھا! کوئی خاندانی یا قبائلی مغائرت ہے! لیکن کیا اس نے کوئی اثر قبول کیا؟ علماءِ یہود نے کوئی اثر قبول کیا جب کہ قرآن کی گواہی یہ ہے : يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اس لیے کہ دل سخت ہو گئے تھے۔ اس میں گداز اور نرمی مفقود تھی۔ لہٰذا پہلی چیز دلوں میں گداز پیدا کرنا ہے ۔ زمین میں ہل چلا ہو تو بارش فائدہ دے گی ۔ چٹیل میدان میں بارش برسی اور پانی بہہ گیا۔ ہاں زمین کو تیار کیا ہوا ہے، ہل چلایا ہوا ہے۔ اب کسی کسان سے پوچھئے کہ بارش کا برس جانا اس کے لیے کتنا خوش آئندہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید پہلے موعظہ ہے اور موعظہ کے بعد ہے : شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔

نوعِ انسانی کے لیے قرآن میں افادیت کا جو تیسرا پہلو ہے اُسے اس آیت مبارکہ میں " هُدًى " کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا۔ یعنی قرآن سراپا ہدایت ہے۔ یہ ہدایت کیا ہے! میں جہاں تک سمجھا ہوں غور کیجئے،

ایک کی خواہش یہ ہے کہ اُس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے ۔ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ط
اور ان کی یہ طویل عمری بھی ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والی نہیں ہے ۔ حُبّ دنیا اور حبِّ مال و
وجاہت کے ساتھ حق کو قبول کرنے میں ایک بڑی دوسری رکاوٹ ان اہل کتاب بالخصوص یہود کا حسد
تھا۔ وہ اس غیظ وغضب میں جل بھن رہے تھے کہ آخری نبوت و رسالت کا تاج بنی اسمٰعیل کے ایک
چشم و چراغ کو کیوں پہنا دیا گیا! ۔ یہ منصب جلیل محمد کو کیوں مل گیا (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہیں اصل میں قلب
کے روگ ۔ ظاہر بات ہے کہ جس کی جتنی اہمیت ہوگی اسی اعتبار سے اس کے اثرات معاشرہ پر مترتب
ہوں گے ۔ ایک بے چارا عام آدمی جو کسی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا ۔ وہ اپنی دو وقت کی روٹی کمانے میں
لگا ہوا ہے ۔ اس میں یہ روگ ہوں گے بھی تو ان کے اثرات اس کی ذات تک محدود رہیں گے ۔لیکن
اگر یہ روگ لیڈروں میں ہوں، اگر یہ بیماریاں اُن حضرات میں پرورش پا رہی ہوں جو دینی اعتبار سے سربرآوردہ
ہوں تو یہ متعدی بنتی ہیں۔ یہ وبائی شکل اختیار کرتی ہیں۔ اس لیے کہ جن سے خیر کی توقع ہو ان میں یہ خرابیاں
آجائیں تو صورت یہ ہوگی کہ اگر نمک اپنی نمکینی کھو دے تو پھر نمکینی کہاں سے حاصل کی جائے گی ؟ یہ ہے
وہ چیز جس کی خبر دی تھی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمانو! یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ
زَمَانٌ : " اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے دور سے بھی سابقہ پڑے گا کہ : لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا
اِسْمُهٗ ۔ "اسلام میں سے باقی نہیں بچے گا سوائے نام کے "۔ دیکھ لیجئے ہماری زبانوں پر " اسلام
زندہ باد " کے فلک شگاف نعرے ہیں لیکن ہماری انفرادی زندگی میں اسلام خالی خالی نظر آئے گا اور
اجتماعی زندگی تو اس سے یکسر خالی ہے ۔ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ ۔ " اور قرآن میں سے باقی
نہیں بچے گا مگر حروف کا رسم الخط "۔ یعنی حروف والفاظ تو تا قیامِ قیامت محفوظ رہیں گے چونکہ
اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے : اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ o
لیکن اس کی کما حقہٗ تلاوت، اس پر غور و تدبر، اس کے اوامر و نواہی پر عمل اور ان کا اجرا، اس کی طرف نوعِ انسانی
کو دعوت اور اس کی تبلیغ، یہ کام باقی نہیں رہیں گے ۔ رہے بھی تو برائے نام آگے حضورؐ فرماتے ہیں : وَمَسَاجِدُهُمْ
عَامِرَةٌ وَّهِیَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰی " ان کی مسجدیں آباد بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی (بباطن)
ویران و خراب "۔ اس حدیث میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے 'خراب'۔ ہم عام بول چال میں " خانہ خراب " بولتے
ہیں جس کا مفہوم ہوتا ہے کہ امن و سکون اور اطمینان رخصت ہوا ۔ اسی لفظ سے بابِ تفعیل سے لفظ 'تخریب'
بنا ہے ۔ جس کے معنی ہیں، خرابی و ویرانی پیدا کرنا ۔ توڑ پھوڑ کرنا ۔ بدامنی پھیلانا ۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک
خاص گروہ کی جانب سے دوسرے مسلک کی مسجدوں پر زبردستی اور بزور قبضہ کرنے کے لیے بھی سب کچھ ہو

رہا ہے۔ برطانیہ میں تو باقاعدہ خون ریز فسادات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے کئی مسجدوں کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ دنگا فساد رُک سکے ۔۔۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مسجدیں ہوں گی بڑی عالیشان، بہت اُونچی، تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ـ Well Furnished ـ قالین بچھے ہوئے۔ ائیرکنڈیشن لگے ہوئے۔ آباد بھی ہونگیں۔ لوگ بکثرت آیا کریں گے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰى۔ اور اب آگے حضورؐ کا وہ ارشاد آ رہا ہے جو دلوں کے روگوں سے متعلق ہے خاص طور پر جب وہ علماء و فضلاء کے طبقے کی اکثریت میں پیدا ہو جائیں: عُلَمَآءُ هُمْ شَرٌّ مَّنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ۔ "آسمان کی چھت کے نیچے ان کے علماء بدترین لوگ ہوں گے۔ انہی علماء کی طرف سے فتنہ برآمد ہوگا اور انہی میں لوٹ جائے گا" یہاں مراد ہیں علماءِ سوء چونکہ ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اُمّتِ مرحومہ کسی دور میں بھی علماءِ حق اور علماءِ ربّانی سے خالی نہیں رہے گی چاہے وہ معدودے چند ہوں ۔۔۔ ان علماءِ سُوء کا کام ہوگا۔ فتنہ پردازی، تفرقہ بازی، مسلمانوں کو لڑاؤ۔ ان کو آپس میں لڑاؤ ۔۔۔ نئی نئی چیزیں ایجاد کرو، نئے نئے شعائر کا پرچار کرو، اپنی علاحدہ علاحدہ علامتیں متعین کرو تاکہ ہماری سیادتیں اور چودھراہٹیں قائم رہیں ۔۔۔ یہ ہے معاملہ دلوں کے روگوں کا:

قرآن کی عظمت کی افادیت والا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ امراض کا مداوا اور ازالہ بنے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دل نرم ہو چکے ہوں ورنہ قرآن ایسے گزر جائے گا جیسے چکنے گھڑے پر پانی پڑتا ہے اور بہہ جاتا ہے، جذب نہیں ہوتا۔ جب تک کہ دل کے اندر گداز نہ ہوگا، قرآن مجید کا فائدہ نہیں ہوگا۔۔۔ آپ غور کیجئے کہ مشرکین مکّہ کو قرآن سنانے والے کون! محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔ لیکن کیا ابوجہل پر اثر ہوا؟ چلیئے وہ تو دوسرے خاندان سے تھا۔ ابولہب کون تھا! کوئی خاندانی یا قبائلی مغائرت ہے! لیکن کیا اس نے کوئی اثر قبول کیا؟ علماءِ یہود نے کوئی اثر قبول کیا جب کہ قرآن کی گواہی یہ ہے: يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اس لیے کہ دل سخت ہو گئے تھے۔ اس میں گداز اور نرمی مفقود تھی۔ لہٰذا پہلی چیز دلوں میں گداز پیدا کرنا ہے۔ زمین میں ہل چلا ہو تو بارش فائدہ دے گی ۔۔۔ چٹیل میدان میں بارش برسی اور پانی بہہ گیا۔ اں زمین کو تیار کیا ہوا ہے، ہل چلایا ہوا ہے۔ اب کسی کسان سے پوچھئے کہ بارش کا برس جانا اس کے لیے کتنا خوش آئندہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید پہلے موعظہ ہے اور موعظہ کے بعد ہے: شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ۔

نوعِ انسانی کے لیے قرآن میں افادیت کا جو تیسرا پہلو ہے اُسے اس آیت مبارکہ میں "هُدًى" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا۔ یعنی قرآن سراپا ہدایت ہے۔ یہ ہدایت کیا ہے! میں جہاں تک سمجھا ہوں غور کیجئے،

اہل علم کی توجہ کے لیے عرض کر رہا ہوں۔ اس سے مراد ہے انسان کی ذہنی و فکری رہنمائی۔ اس لیے کہ ایک شخص کی عقلی اور ذہنی صلاحیت بہت اونچی ہے۔ لیکن ذہن و فکر میں کجی ہے۔ نیت میں کھوٹ ہے تو یہ اعلیٰ عقل مندی، اعلیٰ ذہانت فائدہ کے بجائے مضر ہو جائے گی۔ وہ EVIL GENIUS یعنی برائی کے حق میں غیر معمولی ذہین بن جائے گا۔ ترتیب یہ ہے کہ پہلے گداز ہو۔ پھر قلب کے امراض و رذائل کا مداوا اور ازالہ ہو: شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہ والا معاملہ ہو۔ اب گویا پردے ہٹ گئے حجابات دور ہو گئے اب قرآن حمید انسانی فکر کے لیے رہنمائی ہے۔ انسانی سوچ کے لیے رہنمائی ہے۔ انسانی معاملات کے لیے رہنمائی ہے، تمدنی ارتقا کے ساتھ جو بھی نئی سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں، جو الجھنیں بڑھ رہی ہیں جو مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ ان سب کا حل اس قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ تزکیہ سے کہ نیت درست ہو چکی ہو، دل نرم پڑ چکے ہوں۔ سینے کے اندر کے رذائل کا ازالہ ہو چکا ہو۔ تو یہی قرآن ہے جو ایسے تمام مسائل کے معتدل و متوازن حل کی طرف رہنمائی کرے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ اس میں قرآن مجید کی عظمت و فضیلت کا بڑی جامعیت کے ساتھ بیان ہے۔ امام ترمذی اور امام دارمی رحمہما اللہ نے اپنی مرتب کردہ صحیح احادیث کے مجموعوں میں اس کو روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو ہم نے بہت عام کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّھَا سَتَکُوْنُ فِتْنَۃٌ۔ "عنقریب ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہونے والا ہے"۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: قُلْتُ۔ میں نے عرض کیا: مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ — دیکھئے میں یہاں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کا مزاج کیا تھا! انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ فتنہ کب آئے گا یا کیوں آئے گا اور کیسا ہو گا اور کہاں سے یہ فتنہ آئے گا! یہ سارے سوالات علمی ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا رجحان عمل کی طرف تھا لہٰذا حضرت علیؓ نے ان علمی سوالات میں سے کوئی نہیں کیا۔ سوال کیا تو صرف ایک: مَا الْمَخْرَجُ مِنْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ "حضورؐ یہ فرمائیے کہ اس سے نکلنے کا راستہ کون سا ہو گا۔" آپؐ نے فرما دیا کہ فتنہ آئے گا۔ اب ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے، اس سے بچنے کا راستہ بتائیے۔ یہ ہے عملی شکل۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے جو ارشاد فرمایا ہے، میرے حقیر مطالعہ کی رو سے عظمت و فضیلت قرآن پر یہ طویل ترین حدیث ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم نے اے علیؓ اس فتنہ کا مخرج پوچھا ہے تو سن رکھو: "کِتَابُ اللّٰہِ"۔ یہ اللہ کی کتاب ہے جو فتنہ سے بچانے والی ہے۔ پھر آپؐ نے کتاب اللہ کی مدح ان الفاظ میں فرمائی: فِیْہِ نَبَأُ مَا قَبْلَکُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَکُمْ وَحُکْمُ مَا بَیْنَکُمْ۔" اس میں تم سے پہلے جو لوگ گزر چکے ان کے حالات بھی ہیں، تمہارے بعد جو حالات آنے والے ہیں، ان کی خبریں بھی اس میں موجود

ہیں تمہارے مابین تاقیام قیامت جتنے جھگڑے اور قضیئے اٹھیں گے ان سب کا حل اس میں موجود ہے۔ "هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ۔" یہ (قرآن) قول فیصل ہے، یہ فضول بات اور یاوہ گوئی سے پاک ہے، جو کوئی غرور اور سرکشی کے باعث اس سے منہ موڑے گا تو اللہ اس کو توڑ کر رکھ دے گا۔ اور جو کوئی قرآن کو چھوڑ کر کہیں اور سے ہدایت کا متلاشی ہوگا اللہ اُسے گمراہ کر دے گا۔" یعنی اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی اور وہ ہدایت سے محروم رہے گا۔" وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ" اور قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسی یعنی اللہ سے تعین کا مضبوط ذریعہ اور وسیلہ ہے[1]، قرآن ہی محکم نصیحت نامہ ہے"۔ سورہ یونس میں قرآن کو موعظہ قرار دیا گیا اور یہاں ذکر۔ جس کے معنی و مفہوم یاد دہانی اور نصیحت ہے[2]۔ "اور قرآن ہی صراط مستقیم ہے"۔ نماز کی ہر رکعت میں جب آپ سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ تو وہ صراط مستقیم ہمیں اللہ نے قرآن مجید کی صورت میں عطا کیا ہوا ہے۔ اس پر غور کرو، اسے سمجھو، اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرو تمہیں اپنے تمام مسائل کا حل اسی قرآن میں ملے گا۔ حدیث کا ابھی کچھ حصہ باقی ہے وقت کی کمی کی وجہ سے میں اُسے چھوڑ رہا ہوں۔ انجمن کی طرف سے دورانِ رمضان ایک چار روزہ شائع کیا گیا ہے جس میں یہ پوری حدیث مذکور ہے اسے حاصل کر کے اس کا مطالعہ کرنے کی درخواست ہے۔

سورہ یونس کی زیر گفتگو آیت میں جو تیسرا لفظ آیا هُدًى ــــ تو اس کی قدرے تشریح میں نے بیان کی ہے اور اسی ضمن میں عظمت و فضیلت قرآن سے متعلق حضرت علیؓ سے مروی ایک طویل اور جامع حدیث کے اکثر حصے کی بھی وضاحت ہوگئی۔ قرآن کو متعدد مقامات پر اور متعدد مباحث کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے "الھدیٰ" فرمایا ہے۔ میرے غور و مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ "الھدیٰ" کے لفظ میں ذہنی و فکری رہنمائی کے مفہوم کا عنصر غالب ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب علمی رہنمائی ہوگی تب ہی عملی رہنمائی بھی ہو گی۔ اس لیے کہ صحیح علم صحیح عمل کو جنم دیتا ہے۔ صحیح فکر صحیح رویہ کو پیدا کرتا ہے۔ صحیح نقطۂ نظر انسان کے صحیح طرزِ عمل پر منتج ہوتا ہے۔ لہٰذا نظریہ اگر درست ہوا، فکر درست ہوا، رہنمائی صحیح ملی تو عمل بھی

---

[1] سورہ آل عمران میں جو حکم آیا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ تو حدیث کے اس حصہ نے اس کی تعیین و توضیح اور تشریح و تفسیر فرما دی کہ حبل اللہ سے مراد صرف قرآن مجید ہے۔ (مرتب)

[2] ہم نے نامعلوم ذکر کے کون کون سے طریقے استعمال کر رکھے ہیں۔ جبکہ الذکر، مجسم ذکر، اور سراپا ذکر یہ قرآن ہے۔

درست و صحیح ہوگا۔

اس آیت مبارکہ کے آخری حصے پر توجہ کیجئے! نہایت جامع الفاظ ہیں: وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ "یہ قرآن اہل ایمان کے لیے مجسم رحمت ہے" گویا رحمتِ خداوندی کا سب سے بڑا مظہر خود قرآن مجید ہے۔ جیسے فرمایا اَلرَّحْمٰنُ ٥ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ٥ "اُس تبارک و تعالیٰ ہستی نے جس کی رحمت ٹھاٹیں مارتے ہوئے سمندروں کی طرح سے پرجوش ہے بلکہ اس کی رحمانیت کے مقابلہ میں سمندر کھیجان پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا، اس قرآن کا علم عطا کیا ہے۔ اس تعؐ نے اپنے محبوب اور رحمۃ للعلمین ﷺ کو اس قرآن کی تعلیم دی ہے[1] ۔ یہی قرآن میدانِ حشر میں اپنے ماننے والوں، دلی یقین رکھنے والوں، اس کی تلاوت کرنے والوں، اس پر غور و تدبر کرنے والوں، اس پر عمل کرنے والوں اور اس کی دعوت دینے اور اس کی تبلیغ کرنے والوں کے حق میں حجت بنے گا، ان کے لیے شفاعت کرے گا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران میدانِ حشر میں دو بدلیوں کی صورتوں میں ظاہر ہونگیں اور جن کو ان سُورتوں سے محبت تھی، جو ان کو پڑھتے تھے، ان پر سایہ کریں گی۔

ایک پڑھنا ہمارا ہے۔ وہ طوطے کی طرح رٹا ہوا اور تیز میل کی رفتار سے تراویح میں پڑھا ہوا قرآن۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ خیر سے خالی ہے۔ ثواب ملے گا۔ ایک شخص اپنے مشاغل اور آرام کو چھوڑ کر آیا ہے، اس نے وضو کیا ہے، عشاء کی نماز ادا کی ہے پھر اس نے قریباً ایک گھنٹہ صلوٰۃ التراویح میں لگایا ہے۔ وہ دنیا کا تو کوئی کام نہیں کر رہا! اس کا اجر یقیناً محفوظ ہے۔ لیکن اس قرآن سننے اور سنانے کا جو اصل مقصد ہے، وہ حاصل نہیں ہوتا۔ اصل بات سمجھنے کی ہے! حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ فرماتے ہیں کہ "میں نے صرف سورہ بقرہ پر آٹھ برس تک تدبر کیا ہے" عربی زبان ان کی اپنی، صرف و نحو ان کو نہیں پڑھنی۔ پھر یہ کہ شانِ نزول کی روایات کی ان کو تلاش نہیں کرنی۔ وہ اس ماحول کا جزو ہیں، جس میں قرآن اتر رہا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب اور اکابر صحابہ کرام سے مستفید ہونے والے بزرگ، اور پھر سورہ بقرہ پر آٹھ برس صرف کر رہے ہیں! یہ بات بطور مثال میں نے پیش کی ہے۔ صحابہ کرامؓ کا حال

---

[1] سورۃ الرحمٰن کی ان ابتدائی دو آیتوں پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے حاشیہ تحریر فرمایا ہے: "اللہ کے عطایا میں سب سے بڑا عطیہ اور اس کی نعمتوں میں سے سب سے اونچی نعمت و رحمت (یہ قرآن مجید) ہے۔ انسان کے ظرف پر خیال کرو اور علم قرآن کے اس دریائے ناپیدا کنار کو دیکھو، بلاشبہ ایسی ضعیف البنیان ہستی کو آسمانوں اور پہاڑوں سے زیادہ بھاری چیز کا حامل بنا دینا رحمان ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ کہاں بشر اور کہاں خدا کا کلام! (مرتب)

یہ تھا کہ قرآن مجید کا جتنا حصہ پڑھتے جاتے تھے اس کے مطابق عمل کرتے جاتے تھے۔ بہرحال افادیت کے اعتبار سے سورہ یونس کی آیت نمبر ۵۷ کے حوالہ سے یہ چار الفاظ ذہن نشین کر کے یہاں سے اٹھئے کہ یہ کتاب نوعِ انسانی کے لیے خاص اللہ کی طرف سے موعظۃ، شفاءٌ لما فی الصدور، ہدایت اور اہلِ ایمان کے لیے بالخصوص، نوعِ انسانی کے لیے بالعموم رحمت بن کر نازل ہوئی ہے۔ میں نے آغاز میں سورہ یونس کی آیت نمبر ۵۸ کی بھی تلاوت کی تھی۔ وقت کی کمی کے باعث اس کی تشریح ممکن نہیں پھر مجھے آپ حضرات کو ایک دعوتِ عمل بھی دینی ہے لہٰذا صرف رواں ترجمانی پر اکتفا کرتا ہوں۔ فرمایا: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ اے نبی کہہ دیجئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کا مظہر ہے (کہ قرآن جیسی نعمت تمہیں عطا ہوئی) پس چاہیئے کہ لوگ اس پر شاداں و فرحاں ہوں۔ یہ اُس سب سے بہت بہتر ہے، افضل و اعلیٰ ہے جو کچھ یہ لوگ جمع کر رہے ہیں۔" لوگ دولتِ دنیا کو قیمتی متاع سمجھتے ہیں اور اس کو جمع کرنے میں حلال و حرام تک کی تمیز نہیں کرتے۔ یہ چیزیں ان کو جہنم کا ایندھن بنانے والی ہیں، جبکہ قرآن رشد و ہدایت کی صراطِ مستقیم ہے جس پر عمل کرنے پر ہی آخرت کی فوز اور فلاح و کامرانی کا اصل دار و مدار ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس کا مفہوم ہے کہ قرآن مجید جیسی عظیم دولت کے مقابلہ میں اگر کسی کو یہ خیال آیا کہ اس سے بڑی دولت، دولتِ دنیوی ہے تو وہ کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوا۔ ظاہر بات ہے اللہ کی نعمت کے کفران کا نتیجہ آخرت میں اللہ کی سزا اور دنیا میں رسوائی اور خواری کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے!

ایک بات میں یہ بھی عرض کر دوں کہ بعض اوقات انسان کو کوئی فیض حاصل ہوتا ہے لیکن اُسے اس کا شعور نہیں ہوتا۔ میں نے جس شدت سے موجودہ صورتِ حال کی نفی کی ہے۔ اس سے مایوس نہ ہو جائیں کہ بس یہ رسم تھی، رمضان نیکیوں کا موسم بہار بن کر آیا اور گزر گیا۔ ہو سکتا ہے کہ جن حضرات نے روزے رکھے صلوٰۃ التراویح ادا کی غیر شعوری طور پر کچھ دولت ان کو حاصل ہوئی ہو۔ لیکن اس کا انہیں شعور حاصل نہ ہو۔ لہٰذا اوقات ایسا ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ میں سے ہر شخص اپنے آپ کو ٹٹولے۔ اللہ تعالیٰ نے ماشہ بھر، تولہ بھر جو خیر بھی کسی کو عطا فرمایا ہے اور قرآن مجید کی طرف جو بھی توجہ ہوئی ہے اُسے ہم میں سے ہر شخص اپنا بنیادی اثاثہ (STARTING CAPITAL) بنائے اور اس سرمایہ اور اثاثہ میں اضافے کی فکر کرے۔ عربی زبان سیکھنے کی طرف توجہ کرے۔ یہ نہ سوچے کہ میری عمر اب پڑھنے کی کہاں رہ گئی ہے۔ ہم نے اکثر ادھیڑ عمر کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی ترقی کی خاطر ڈیپارٹمنٹل امتحان کے لیے بڑی محنتیں کرتے ہیں۔ تو عمر کا معاملہ رکاوٹ نہیں بنتا۔ رکاوٹ بنتا ہے ضعفِ ارادہ — اور میں تو یہ کہا کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی قرآن نازل ہونا شروع ہوا جب آپ کی عمر شریف چالیس برس کی تھی۔ تو آپ غور کیجئے کہ ہم کو یہ زیب دے گا کہ ہم میں سے کوئی یہ سوچنے لگے

کریں OVER AGE ہو چکا ہوں اضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن پڑھنے، سمجھنے اور عربی سیکھنے کے لیے ایک عزم مصمم پیدا کریں۔ اس کا ان شاءاللہ ایک بہت مفید نتیجہ نکلے گا۔ آپ لوگوں کو معلوم ہو گا کہ بھارت میں ہائی کورٹ کی سطح پر ایک رٹ داخل کی گئی تھی کہ قرآن مجید پر پابندی لگائی جائے چونکہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو جہاد و قتال کی تعلیم دیتی اور تشویق و ترغیب دلاتی ہے۔ بہرحال وہاں کے ججوں نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا ہے کہ اس رٹ کو مسترد (RULE OUT) کر دیا۔ اگر خدانخواستہ وہاں قرآن مجید پر پابندی کا فیصلہ ہو جاتا تو میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ بھارت کا مسلمان ہم سے کئی گنا زیادہ غیور ہے۔ کیا قیامت صغریٰ وہاں آتی اس کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ اور اگر وہاں مسلمان کھڑا ہو گیا ہوتا تو اللہ جانے اس کا ردِ عمل کیا ہوتا، کتنی خون کی ندیاں بہتیں!۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا کہ جج صاحبان نے اس کو مسترد کر کے بات ختم کر دی۔ لیکن جان لیجیے کہ یہ بات آج پہلی مرتبہ نہیں ہوئی۔ یہ بات برطانیہ کے لارڈ جارج نے آج سے تقریباً پچاس برس قبل کہی تھی۔ اس نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں قرآن لہرایا تھا اور کہا تھا کہ جب تک دنیا میں یہ کتاب موجود ہے امن قائم نہیں ہو سکتا[1]۔ یہ بات جسے دشمن اپنی دشمنی کے اظہار کے لیے دشمنی ہی کے انداز سے بیان کر رہا ہے وہ اصل میں کیا ہے؟ اس کو معروضی انداز میں سمجھیے — واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب ہے کہ اگر کسی درجہ میں بھی اس کا آپ پر انکشاف ہو جائے تو آپ کے اندر ایک بجلی بھر جائے۔ آپ پھر باطل کے وجود کو برداشت کرنے والے نہیں ہوں گے۔ جس طرح قرآن مجید نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو متحرک (MOTIVATE) کیا ہے وہ نقشہ قرآن میں موجود ہے۔ احادیث اور کتب سیر میں موجود ہے۔ ان میں سرفروشی، جاں نثاری کا ایسا جوش و خروش پیدا کیا ہے کہ وہ گھر بار، اہل و عیال، مال و منال سب چھوڑ چھاڑ کر اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر اس عزم و جزم کے ساتھ میدانِ کارزار میں نکل آئے کہ یا اب حق کا بول بالا ہو گا اور یا ہم راہِ حق میں اپنی گردنیں کٹوا دیں گے۔ سورۂ احزاب میں ان سرفروشوں اور ان فدائین کا ایک نقشہ بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝	"اہل ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور

---

[1] یہی بات آریہ سماج کے مشہور لیڈر سوامی شردھا نند نے بھی اغلباً ۱۹۲۶ء میں کہی تھی۔

کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے اور ان اہلِ
ایمان نے اپنے رویّے اور طرزِ عمل میں ذرّہ برابر
تبدیلی نہیں کی۔"

قرآن واقعتاً وہ کتاب ہے جو اس پر ایمان رکھنے والوں کے اندر بجلی بھر دیتی ہے۔ یہ تو ہم نے اُسے بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ اُسے صرف کتابِ مقدس کا درجہ دیا ہوا ہے۔ اُسے حصولِ ثواب بلکہ اب تو زیادہ تر ایصالِ ثواب کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ ورنہ اگر یہ قرآن منکشف ہو جائے تو وہ ایمان اور یقین دلوں میں راسخ ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں حق کے ساتھ جینا ہے اور حق کے ساتھ مرنا ہے۔ ہم نے باطل کو للکارنا ہے اس سے نبرد آزما ہونا ہے۔ ہم نے اسی کا اپنے رب کے ساتھ سودا کر لیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۔" اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہے مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے"۔ آگے فرمایا کہ اہلِ ایمان اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ اللہ کی راہ میں قتال کا حکم کسی دوسری الہامی کتاب میں آپ کو نہیں ملے گا۔ یہ ہے وہ اصل بات جس سے دشمن خائف رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی درجہ میں بھی قرآن مجید سے ہمارا قلبی یقین والا تعلق قائم ہو گیا تو زندگیوں میں انقلاب آئے گا۔ اور پھر واقعتہً وہ انقلاب ایک عظیم عالمی انقلاب پر منتج ہوگا کہ حق کا بول بالا ہو، اللہ کا دین غالب ہو، اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

رمضان کو چونکہ گزرے ابھی آٹھ دن ہوئے ہیں اس لیے میں نے اسی مناسبت سے کوشش کی ہے کہ رمضان المبارک اور قرآن مجید میں جو ربط و تعلق ہے اُسے آج کی گفتگو میں کچھ واضح کروں اور اسطرح ایک نگاہ بازگشت کے انداز میں آپ کو قرآنِ حکیم کی طرف اپنی توجہات کو منعطف و مرتکز کرنے کی دعوت دوں۔ آپ کی یاد دہانی کراؤں کہ کائنات میں قرآن حکیم اللہ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر ہے جو ہمیں رحمۃ للعٰلمین، خاتم النبیین، سید المرسلین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملا ہے۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری بات یہی فرمائی تھی کہ: قَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَّا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا كِتَابُ اللّٰهِ۔ خطبہ کے آغاز میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ لوگو! میں تو اب جا رہا ہوں۔ شاید دوبارہ اس جگہ ملاقات نہ ہو۔ آخر میں فرمایا کہ میں تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ میں تمہارے مابین وہ چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ اور وہ ہے کتاب اللہ۔

(بقیہ صـ۱۶ پر)

قسط ۳

ھدایت القرآن

مولانا محمد تقی امینی

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ اے اللہ ہمیں سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی فرما

اوپر کی آیت میں دینے (عبادت) لینے (استعانت مدد مانگنے) کا تعلق خالص اللہ سے کرنے کے بعد اس آیت میں بندہ اللہ ہی سے راستہ کی رہنمائی کی دُعا کرتا ہے۔

ہدایت کے معنی راستہ بتانا، راستہ پر لگانا اور رہنمائی کرنا ہے، صراط مستقیم کے معنی سیدھا راستہ، وہ راستہ جس سے فلاحِ دارین حاصل ہو وہ راستہ جو دنیا و آخرت میں کامیاب بنائے۔

"رہنمائی کا کام عقل بھی کرتی رہتی ہے لیکن بہت سی جگہ تنہا عقل کی رہنمائی ناکافی ہوتی یا اس کی رہنمائی غلط ثابت ہوتی ہے اس بنا پر عقل کی رہنمائی و کارگزاری دور تک تسلیم کرنے کے باوجود بھی کسی اور رہنمائی کی ضرورت باقی رہتی ہے اور وہ "آسمانی رہنمائی" ہے جو صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کی طرف رہنمائی کرتی اور اس کے درست ہونے کی ضمانت پیش کرتی ہے یہ "آسمانی رہنمائی" اس کمی کو دور کرتی ہے جو عقل میں پائی جاتی ہے اور ان چاکوں کی رفوگری کرتی ہے جن میں عقل بے بس ہے اور ان گوشوں کی رہنمائی کرتی ہے جو اگرچہ عقل کی سرحد سے پار ہیں لیکن وہ گوشے انسان میں موجود ہیں۔

یہ آسمانی رہنمائی کہ (جو اللہ اپنے پاس سے بھیجتا ہے) اور عقل (جو انسان کے پاس موجود ہوتی ہے) کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ ٹکراؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آسمانی رہنمائی کی اصلی شکل برقرار نہیں رہتی اس میں ملاوٹ آجاتی ہے اور عقل اپنی جگہ قائم نہیں رہتی بلکہ ہوس کا شکار ہو کر بے قابو ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ان حضرات کو دیکھنا ہوگا جن کے پاس دونوں (آسمانی رہنمائی اور عقل) اپنی اپنی اصلی حالت و شکل میں موجود ہوں، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں جن سے بڑھ کر روئے

زمین پر کوئی پیدا نہیں ہوا اور جن کی عظمت و بڑائی کے آگے سبھی کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں ان کے پاس جو "آسمانی رہنمائی" ہوتی ہے وہ صاف شفاف اپنے سرچشمہ سے نکلی ہوئی موجود ہوتی ہے، ان کے پاس جو عقل ہوتی ہے وہ ہوس کا شکار ہوئے بغیر اپنی اصلی حالت پر قائم ہوتی ہے، لیکن تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ان کی عقل اور آسمانی رہنمائی میں کبھی ٹکراؤ ہوا ہو جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں (آسمانی رہنمائی اور عقل) جب اپنی اصلی حالت و شکل میں ہوتے ہیں تو ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا ہے اور جہاں دونوں یا ان میں کوئی اپنی اپنی جگہ سے ہٹے تو بس ٹکراؤ ہی ٹکراؤ نظر آتا ہے۔

ٹکراؤ کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسانہ گھڑا ہی اس وقت گیا ہے جبکہ دونوں نے اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی، عقل ہوس کا شکار ہو کر بے لگام ہو گئی تھی اور آسمانی رہنمائی میں ملاوٹ آگئی تھی۔

اس تاریخ کو سمجھنے کے لیے بھی انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں موجود آسمانی رہنمائی اور اسوقت کے لوگوں کی عقل پر نظر کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ حضرات جب تشریف لاتے ہیں تو ایسا نہیں ہوتا کہ آسمانی رہنمائی بالکلیہ ختم ہو جاتی ہو بلکہ وہ موجود رہتی اور اس پر عمل درآمد باقی رہتا ہے لیکن وہ اصلی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ملاوٹ آجاتی ہے، جس کی بناء پر اس سے انبیاء علیہم السلام کی عقل (جو بے داغ ہوتی ہے) کا قدم قدم پر ٹکراؤ ہوتا ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام جو آسمانی رہنمائی لاتے ہیں وہ اصلی ہوتی ہے لیکن اس کا ٹکراؤ قدم قدم پر لوگوں کی اُس عقل سے ہوتا ہے جو اپنی جگہ نہیں ہوتی بلکہ بے لگام ہو جاتی ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ دونوں (آسمانی رہنمائی اور عقل) میں ٹکراؤ پر جب بھی گفتگو ہوئی وہ یکطرفہ رہی، عقل کے نمائندوں نے عقل کو معصوم قرار دے کر آسمانی رہنمائی میں کانٹ چھانٹ کا مشورہ دیا اور آسمانی رہنمائی کے نمائندوں نے عقل کو قابل گردن زدنی سمجھ کر اس کو مردود و ملعون قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں ٹکراؤ کا سبب دونوں کا اپنی اپنی اصلی حالت و شکل میں نہ ہونا) جان کر اس کو دور کرنے کی سنجیدہ کوشش نہ ہو سکی تاریخ میں جس قدر کوششیں محفوظ ہیں وہ عمل و ردِ عمل کی نفسیات کا شکار معلوم ہوتی ہیں۔

"آسمانی رہنمائی" اگر عقل کی حوصلہ افزائی کرتی اور اس کے ہر چھوٹے بڑے کام میں دخل اندازی کے بجائے بوقت ضرورت صرف "تصحیح" پر اکتفا کرتی تو غالباً ٹکراؤ کی اتنی ضخیم تاریخ نہ مرتب ہو پاتی، لیکن یہ فرض وہی "آسمانی رہنمائی" انجام دے سکتی ہے جو اصلی شکل میں محفوظ ہو اور ذہنوں پر اس کی گرفت بھی مضبوط ہو۔

"آسمانی رہنمائی" جس صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے اس کی بنیادی باتیں یہ ہیں۔

(۱) ایمان و اعتقاد سے متعلق مثلاً ہر قسم کی خوبیوں سے اللہ کو آراستہ سمجھنا، اللہ کی پاکی بیان کرنا جو اس کی شان کے مناسب ہے، یہ عقیدہ رکھنا کہ تمام واقعات سے پہلے اللہ کے علم میں ایک اندازہ مقرر ہے، اللہ کے فرشتے ہیں جو نافرمانی نہیں کرتے، اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہا رسول بنایا اور کتابیں دیں، قیامت، مرنے کے بعد کی زندگی، دوزخ و جنت سب حق ہیں۔

(۲) طہارت و پاکی سے متعلق مثلاً جسم و لباس کو گندگی و میل کچیل سے پاک صاف رکھنا، قلب و دماغ کو ہر قسم کی آلودگیوں اور آلائشوں سے دور رکھنا، نفس و شرمگاہ کو کثافتوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھنا، زبان، کان، آنکھ وغیرہ کو غلط استعمال سے بچانا۔

(۳) عبادت و طاعت سے متعلق، مثلاً اللہ کی زیادہ سے زیادہ تعظیم کرنا، چہرہ اور دل اس کے سپرد کرنا۔ خالص اس کی عبادت و طاعت کو اپنے اوپر فرض سمجھنا، شعائر (اللہ کی خاص یادگار) کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرنا، عبادت و استعانت (مدد مانگنا) میں غیر کی شرکت حرام سمجھنا اور اللہ ہی کو نفع و ضرر کا مالک و مختار جاننا۔

(۴) نیکی و بدی سے متعلق مثلاً دل کی پاکی و عمل کی سچائی جس کے لیے محض ضابطہ کی خانہ پُری کافی نہیں بلکہ اللہ سے مستقل ربط و تعلق ضروری ہے، نیکی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں محدود نہیں، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام گوشوں سے ہے، کمال نیکی حاصل کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ چیزوں کی قربانی لازمی ہے، نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنی ضروری ہے۔

(۵) پاکیزہ و گندی چیزوں سے متعلق مثلاً پاکیزہ و گندی چیزیں برابر نہیں ہیں، ایک کو دوسرے سے بدلنے کی اجازت نہیں ہے، گفتگو، تعلقات، روزی، زندگی اور اولاد وغیرہ ہر ایک میں پاکیزگی کو اختیار کرنا اور گندگی سے دور رہنا، صراطِ مستقیم کی یہی بنیادی باتیں ہیں جن کی طرف رہنمائی کی بندہ درخواست و دعا کرتا ہے۔

رہنمائی میں یہ بنیادی باتیں اوپر سے نہیں جوڑی جاتی ہیں بلکہ اندر سے ابھاری جاتی ہیں، یعنی آسمانی پیغام نے انسان کی فطرت کو جیسی بنایا ہے اس کے لحاظ سے اس میں ان باتوں کے نقش و نگار ابتداء ہی سے موجود ہوتے ہیں آسمانی پیغام ان نقش و نگار کو ابھار کر ان کا "پیکر" تیار کرتا ہے جس کا نام وہ "دین" تجویز کرتا ہے۔

"فطرت" کے یہ نقش و نگار یکساں ہوتے ہیں اس بنا پر آسمانی پیغام کا "پیکر" سبھی کے لیے یکساں تیار ہوتا ہے یعنی ایک ہی دین ہر زمانہ میں سب انسانوں کے لیے آتا ہے اس میں کوئی

اختلاف نہیں ہوتا، فطرت کے ان نقش و نگار کو ابھار کر "پیکر" تیار کرنے کی کوشش عقل بھی کرتی ہے جس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ مذکورہ باتیں ان لوگوں میں بھی پائی جاتی ہیں جو آسمانی پیغام کے فیض سے محروم ہوتے ہیں لیکن عقل کی رسائی دور تک تسلیم کرنے کے باوجود نقش و نگار کے بعض گوشے اس کے قابو سے باہر ہوتے ہیں پھر عقل صرف اندر ہی کا اثر نہیں قبول کرتی بلکہ باہر کا اثر بھی قبول کرتی ہے جس کی بناء پر عقل کی کوشش میں ملاوٹ آجاتی ہے اور اس کا تیار کیا ہوا "پیکر" اندر کے نقش و نگار سے مطابقت نہیں پیدا کرتا ہے، "آسمانی پیغام" اپنی رسائی اور نقش و نگار سے مطابقت پیدا کرنے میں عقل کی خامیوں سے پاک ہے اس بناء پر عقل کی کوشش سراہنے کے باوجود آسمانی پیغام کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے اور اس نسبت سے درخواست و دعا کی بھی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ — ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا

جس صراطِ مستقیم (سیدھے راستہ) کی اوپر کی آیت میں دعا کی گئی ہے اس آیت میں اس کی پہچان بتائی گئی ہے اور پہچان بھی اس طرح کہ اس کا عملی نمونہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اس راستہ کو دوسری جگہ صراط اللہ (اللہ کا راستہ) کہا گیا ہے (شوریٰ آیت ۵۳) اور اس آیت میں انعام پائے ہوئے لوگوں کا راستہ بتایا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ ہی کا راستہ دنیا و آخرت میں کامیابی و بھلائی اور انعام کا مستحق ٹھہراتا ہے اس راستہ کی طرف ہدایت بجائے خود اللہ کا انعام ہے کہ اس میں محبوب کی اطاعت و فرماں برداری کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ مزید برآں انعام ہے، مثلاً اللہ کی رضامندی حاصل ہونا، پاکیزہ و صاف ستھری زندگی مہیا ہونا، لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا ہونا اور بالآخر اللہ کی رضامندی کی جنت میں داخل ہونا۔ اسی طرح قومی و جماعتی پیمانہ پر یہ اطاعت و فرماں برداری پائی جائے تو اس کے نتیجہ میں عزت و سربلندی حاصل ہونا، حکومت و اقتدار حاصل ہونا، اپنی پسندیدہ راہ کو استقرار و جماؤ حاصل ہونا اور پھر امن و سکون کی عام فضا پیدا ہونا۔

اللہ نے جن کو انعام پائے ہوئے لوگوں میں شمار کیا ہے اور جن کے نقشِ قدم کی پیروی اللہ کی رضامندی کا پتہ دیتی ہے ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ — وہ انبیاء ہیں صدیقین ہیں شہداء ہیں اور صالحین ہیں۔ (النساء آیت ۶۹)

(۱) انبیاءؑ وہ ہیں جو زندگی کے ہر گوشہ میں ہر حیثیت سے حق و صداقت (صراطِ مستقیم) کے داعی اور مبلغ ہوتے ہیں یہی حضرات لوگوں کو سچائی سے روشناس کراتے ہیں اور انہیں کی بدولت دنیا میں سچائی کا نام زندہ اور کام باقی ہے ان کا انتخاب اور تقرر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، یہ اپنی خصوصیات میں یکتا و یگانہ ہوتے ہیں، اپنی جد و جہد اور کوشش سے کوئی ان کے درجہ اور مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

(۲) صدیقین وہ ہیں جن کی زندگی میں حق و صداقت سرایت ہوتی ہے، وہ اس کے سانچے میں اس طرح ڈھلے ہوتے ہیں کہ اس کے خلاف سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے ہیں حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں ہوائیں کتنی ہی مخالف کیوں نہ چل رہی ہوں؟

(۳) شہداء وہ ہیں جن کی زندگی میں حق و صداقت کی شہادت اور گواہی نمایاں ہوتی ہے، زبان و قلم اور کردار و عمل سے وہ اس میں مصروف رہتے ہیں اور اس کام کے لیے کسی وقت اگر جان کی بازی لگانے کا وقت آجائے تو اس سے پیچھے نہیں رہتے ہیں۔

(۴) صالحین وہ ہیں جن کی زندگی اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں بسر ہوتی ہے، برائیوں سے بچتے اور اللہ کے ساتھ چالاکی کا رویہ نہیں اختیار کرتے ہیں۔ وہ رویہ یہ ہے کہ جب تک اپنی ذاتی غرض و فائدہ کا سوال نہ ہو اللہ کی اطاعت و فرماں برداری خوب زور شور کے ساتھ کی جائے اور جب اپنی اطاعت و فرماں برداری میں اپنی غرض نہ پوری ہوتی ہو یا کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو اطاعت و فرماں برداری کو خیرباد کہہ کر غرض پوری کر لی جائے اور فائدہ حاصل کر لیا جائے۔

یہ دراصل درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے انعام پائے ہوئے لوگوں کی تقسیم ہے، سب سے اونچے درجہ اور مرتبہ پر انبیاء علیہم السلام فائز ہوتے ہیں، پھر صدیقین ہیں، اس کے بعد شہداء اور پھر صالحین ہیں، یہ حضرات نیچے درجہ سے ترقی کر کے اونچے درجہ پر پہنچ جاتے ہیں، مثلاً صالحین اطاعت و فرمانبرداری اور اس راہ کی قربانی میں ترقی کر کے شہداء کے درجہ پر پہونچتے ہیں اور شہداء حق و صداقت کی شہادت اور اس راہ کی قربانی میں ترقی کر کے صدیقین کے درجہ پر پہونچتے ہیں، لیکن صدیقین کسی طرح اور کسی سمت بھی ترقی کر کے انبیاءؑ کے درجہ پر نہیں پہونچ پاتے ہیں۔

صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کے پہچان کا مذکورہ طریقہ بتانے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ راستہ کی نشاندہی کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے کہ یہ راستہ آسائش کا نہیں ہے بلکہ آزمائش کا ہے، اس پر چلنا پھولوں کی سیج پر چلنا نہیں بلکہ کانٹوں کے فرش پر چلنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستے پر چلنے والوں کا تعارف بھی اسی طریقہ سے کرایا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ سے پوچھا گیا۔

ای الناس اشد بلاء — کن کو زیادہ آزمائش و مصیبت پیش آتی ہے۔

آپ نے فرمایا:

الانبیاء ثم الامثل فالا مثل — اللہ کے نبیوں کو پھر ان کو جو درجہ اور مرتبہ میں ان کے قریب ہوتے ہیں پھر ان کو جو ان کے قریب ہوتے ہیں۔

(ترمذی و مشکوۃ باب عیادۃ المریض)

آزمائش اور مصیبتوں کا ایک رُخ تو یہ ہے کہ ان کے ذریعہ دل و دماغ کے آئینہ میں وہ خاص چمک پیدا کی جاتی ہے جو ہر ایک کے بلند و برتر مقام کے لیے درکار ہے اور جو لمبا اوقات صرف عبادت و طاعت سے نہیں پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کے علاوہ ان آزمائشوں اور مصیبتوں کا ایک اور رُخ بھی ہے جس کا تعلق عام لوگوں سے ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے کھرے کھوٹے اور حق پسند و مفاد پرست میں امتیاز قائم ہوتا ہے، کھرا اور حق پسند ہر حال میں صراط مستقیم (اللہ کے راستہ) پر قائم رہتا ہے خواہ کتنی آزمائشیں ہوں اور مصیبتیں پیش آئیں، کھوٹا اور مفاد پرست اسی وقت تک صراط مستقیم (اللہ کے راستے) پر قائم رہتا ہے جب تک اس سے آسائش ملتی رہے اور مصیبتوں سے نجات حاصل رہے، قرآن میں ایسے لوگوں کا حال اس طرح ہے۔

فَاِنْ اَصَابَہٗ خَيْرُنِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُنِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ۔ — اگر ان کو آسائش (فائدہ) پہنچتی ہے تو مطمئن رہتے ہیں اور اگر آزمائش و مصیبت پہونچتی ہے تو بدل جاتے ہیں۔

(حج آیت ۱۱)

یہ لوگ گویا کنارے پر کھڑے موقع کے منتظر رہتے ہیں جدھر فائدہ نظر آیا بس ادھر ہی چل پڑے، انہیں لوگوں کے بارے میں ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ۔ (حج آیت ۱۱) — لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی عبادت (اطاعت) کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔

صراط مستقیم (اللہ کا راستہ) بہت سے ٹیڑھے ترچھے راستوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور ہر راستہ میں بڑی کشش و دل فریبی کا سامان ہے، شیطان ان کا داعی و مبلغ ہے، یہ راستے زیادہ دور بھی نہیں ہیں بلکہ صراط مستقیم ہی کے دائیں بائیں ہیں اور ان کے ذریعہ شیطان کامیابی کی منزل تک پہونچانے کا دعویدار بھی ہے، ایسے حالات میں ان سے بچنے اور سیدھے راستے پر قائم رہنے کے لیے بڑے ریاض کی ضرورت ہے اور مسلسل اللہ سے مدد طلب کرتے رہنے کی ضرورت ہے، قرآن نے ان ٹیڑھے ترچھے راستوں سے باخبر کیا ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ (الانعام آیت ۱۵۳)	اور دیکھو یہ میرا بالکل سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو دوسرے طرح طرح کے راستوں کے پیچھے نہ پڑو وہ تمہیں سیدھے راستے سے ہٹا دیں گے۔

ان ٹیڑھے ترچھے راستوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کھینچ کر سمجھایا ہے۔

خط لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطا بیدہ ثم قال ھذا سبیل اللہ مستقیماً ثم خط خطوطا عن یمین ذلک الخط وعن شمالہ ثم قال وھذہ السُبل لیس منھا سبیل الا علیہ شیطان یدعوا الیہ ثم قرأ ھذا الایۃ (نسائی واحمد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے لمبا خط کھینچا اور فرمایا کہ یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا سیدھا راستہ ہے اس کے بعد اس خط کے دائیں بائیں دونوں طرف بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ طرح طرح کے راستے ہیں اور ان میں ہر راستہ پر ایک شیطان ہے جو اس کی طرف بلاتا ہے پھر آپ نے اوپر والی آیت پڑھی۔

زندگی کے ہر مسئلہ اور کاروبار و مشغلہ میں کامیابی کا مدار صراطِ مستقیم ہی پر ہے اور جب ناکامی و محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو کہیں نہ کہیں اس راستہ سے ہٹنا پایا جاتا ہے اس لیے صراطِ مستقیم کو عام رکھا گیا اور ہر موقع پر اس کی دعا کرتے رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ جن پر نہ آپکا غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔

پہلے صراطِ مستقیم (سیدھا راستہ) کی پہچان بتائی گئی ہے، اسمیں ضمناً صراطِ غیر مستقیم (ٹیڑھا ترچھا راستہ) کی پہچان ہے انداز وہی اختیار کیا گیا ہے کہ اس کا عملی نمونہ سامنے آجاتا ہے۔

یہ راستہ ان لوگوں کا ہے جو غضب میں آچکے ہیں اور جو گمراہ ہوئے ہیں، ان کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹیڑھا ترچھا راستہ (صراطِ غیر مستقیم) دنیا و آخرت میں ناکامی و نامرادی اور سزا کا مستحق ٹھہراتا ہے کہ اس میں محبوب (اللہ) کی نافرمانی ہے جو بجائے خود بڑی محرومی ہے پھر اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ مزید برآں ہے مثلاً اللہ کی ناراضگی، خطرہ و خلجان کی زندگی اور بالآخر ناراضگی کی دوزخ میں داخل ہونا۔

اسی طرح قومی و جماعتی پیمانہ پر یہ نافرمانی پائی جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں ذلت و خواری تباہی و بربادی خوف و خطر کی زندگی اور حکومت و اقتدار سے دست برداری بھی آجاتے ہیں۔

جو اللہ کے غضب میں آچکے ہیں اور جن کے تاریخی واقعات اللہ کی ناراضگی کا پتہ دیتے ہیں ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ۔ (آئدہ آیت ۶۰)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا۔

یہ آیت ان یہود کے بارے میں ہے جو خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے تھے اور زندگی کی وہ روشنی بجھ چکی تھی جو انسانیت کو زندہ رکھتی ہے۔

جو گمراہ ہوئے ہیں اور جن کی گمراہی کے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔ (مائدہ آیت ۷۷)

ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ ہوئے اور بہت سوں کو گمراہ کیا اور جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

یہ آیت ان نصاریٰ کے بارے میں ہے جو خواہشات میں پڑ کر صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے تھے اور بہت سی بدعتیں ایجاد کر کے ان پر عمل کرتے تھے۔

یہ دونوں آیتیں یہود و نصاریٰ کے احوال میں ذکر کی گئی ہیں اور ان دونوں میں بالترتیب غضب اور ضلال کے الفاظ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہود اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں۔

ان آیتوں کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں بھی ہے کہ ان سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ (ترمذی و احمد)

لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ صراطِ غیر مستقیم (ٹیڑھے ترچھے راستے) پر چلنے والے یہی دو مذہبی گروہ ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں، اسی طرح یہ بھی ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کی مذکورہ حالت ہمیشہ قائم رہے گی اس میں کبھی تبدیلی نہ ہوگی۔

آیت کا مقصود دراصل ان افکار (اعتقادات) و اعمال (کردار) کی نشان دہی ہے جو ان دونوں گروہوں میں پائے جاتے تھے اور جن کے باعث یہ غضب الٰہی کے مستحق ہوئے تھے اور گم کردہ راہ قرار پائے تھے۔

نزول قرآن کے زمانہ میں چونکہ ان قوموں میں یہ افکار و اعمال پائے جاتے تھے اور ان کے نتائج و انجام سے بھی یہ قومیں دوچار ہو رہی تھیں اس بنا پر مثال کے طور پر ان کو پیش کیا گیا اگر ان کی جگہ کسی اور قوم کو ان کی جیسی نمائندہ حیثیت حاصل ہوتی تو اس کو بطور مثال پیش کر دیا جاتا، مقصود وہ افکار و اعمال ہیں جو ان میں

پائے جاتے تھے وہ نتائج و انجام ہیں جن سے یہ دوچار تھیں مقصود یہ قومیں نہیں ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ یہ اپنی بُری حالت سے نکل کر دوسری حالت میں آجائیں اور دوسری اپنی اچھی حالت سے نکل کر ان کی حالت میں آجائیں لیکن یہ نکلنا افکار و اعمال کی بنا پر ہی ہوگا کسی خصوصیت یا کسی تمغہ و سرٹیفکیٹ کی بنا پر نہ ہوگا۔

گمراہ یہود و نصاریٰ دونوں تھے لیکن دونوں کی گمراہی کی نوعیت میں فرق تھا یہود کی گمراہی میں خبثِ نفس اور شرارت کو زیادہ دخل تھا، جبکہ نصاریٰ کی گمراہی میں کج فہمی و غفلت کو زیادہ دخل تھا، اس فرق کا اثر دونوں کے کردار میں نمایاں تھا، یہود کا کردار زندگی کی صداقتوں اور دینی حقیقتوں میں تفریط کا تھا یعنی کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرکے ان کی اصل صورت بگاڑ دیتے تھے اور جس کی جو حیثیت ہے اس کو کم کرکے اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے۔

نصاریٰ کا کردار زندگی کی صداقتوں اور دینی حقیقتوں میں افراط کا تھا یعنی ان میں غلو اور مبالغہ سے کام لیتے تھے اور اصل کی جگہ بہت سی بدعتوں پر عمل کرتے تھے۔

قرآن میں جن نصاریٰ کا ذکر ہے اور یہود کی نسبت سے جن کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا ہے وہ وہ ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے خلیفہ راشد حضرت شمعونؑ (پیٹر) کے پیروکار تھے ان میں بیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے قرآن کی یہ آیت ان ہی کے بارے میں ہے۔

لتجدن اشد الناس عداوة	تم اہلِ ایمان کے ساتھ دشمنی میں سب سے
للذین آمنوا الیہود والذین اشرکوا	زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے
ولتجدن اقربھم مودة للذین	اور اہلِ ایمان کی دوستی سے زیادہ قریب
آمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ	ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ
(مائدہ ۸۲)	ہیں۔

اور جس فرقہ نے پولس (پال) کی پیروی کی ان کے افکار و اعمال اور حالات زیادہ خراب تھے وہ خود کو "مسیحی" کہلانا پسند کرتے تھے، نصاریٰ کہلانے میں اپنی توہین سمجھتے تھے، موجودہ عیسائی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ (مفردات القرآن۔ فراہی)

یہود و نصاریٰ کے جس قدر افکار و اعمال اور ان کے نتائج و انجام بیان ہوئے ہیں وہ سب احوال اور واقعات کے ذیل میں ہیں الگ سے کوئی باب یا فصل نہیں ہے، یہ اندازِ بیان نہایت مؤثر و دلکش ہے اس سے جو اثر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور سے نہیں پیدا ہوتی۔ مثلاً ایک شکل تو یہ ہے کہ سادے لفظوں میں سچائی کو ظاہر کردیا جائے یعنی صرف اس کہنے پر اکتفا کیا جائے کہ سچ سچ ہے اور اس کا نتیجہ فلاح و کامیابی

ہے۔ جھوٹ جھوٹ ہے اور اس کا نتیجہ خسارہ و ناکامی ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ سچائی کو عملی شکل (پریکٹیکل) میں دکھایا جائے کہ دیکھو! یہ قوم سچ بولتی تھی اس کو اس طرح فلاح و کامیابی نصیب ہوئی اور یہ قوم جھوٹ بولتی تھی اس کو اس طرح خسارہ و ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ اثر کی جو کیفیت دوسری شکل سے پیدا ہوتی ہے وہ پہلی شکل سے نہیں پیدا ہو سکتی۔

اس اندازِ بیان سے انسان کے افکار و اعمال کی خاصیتیں اور زندگی میں ان کے اثرات کھل کر سامنے آجاتے ہیں جس طرح غذاؤں اور دواؤں کی خاصیتیں ہیں اور استعمال کرنے سے ان کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح افکار و اعمال کی بھی خاصیتیں ہوتی ہیں جن کے کرنے و نہ کرنے سے ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ اثرات کبھی جلدی ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی ان کے ظاہر ہونے میں دیر لگتی ہے۔ اس دیر لگنے سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ افکار و اعمال کے خواص و ان کے اثرات سے ہی انکار کر دیتے ہیں حالاں کہ دیر لگنے کے دوسرے اسباب اور دوسرے اعمال ہوتے ہیں جو انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں جس طرح فائدہ مند چیزوں کے استعمال سے فائدہ میں دیر لگتی ہے یا نقصان دہ چیزوں کے استعمال سے فوراً نقصان نہیں پہونچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے اپنی اپنی خاصیتیں بدل دی ہیں اور اثرات میں تبدیلی آگئی ہے بلکہ اس کے اسباب دوسری چیزوں کے اثرات میں تلاش کرنا چاہیئے جن کو وہ استعمال کرتا ہے یا پہلے استعمال کر چکا ہے اور جسم میں ان کے اثرات اب تک موجود ہیں۔ اسی طرح افکار و اعمال کے خواص و اثرات کو بھی سمجھنا چاہیئے، ہماری نظر صرف ایک پہلو کو دیکھتی ہے جبکہ خواص و اثرات کو سمجھنے کے لیے تمام پہلوؤں پر نظر کی ضرورت ہے۔

اس اندازِ بیان سے قانون و اخلاق، تاریخ و سیاست اور فطرت و مذہب سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان سب کو زندگی کے ساتھ جوڑنے والی ایک ایسی طاقت (اللہ) ہے جو حاکم ہی نہیں بلکہ محبوب بھی ہے جو صرف عظمت و جلال کا مظاہرہ نہیں کرتی بلکہ سرور و نشاط کا خزانہ بھی لٹاتی ہے اور جس سے واقفیت کے بعد یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں رہتی کہ اس کے بغیر زندگی میں ایک ایسا خلا رہتا ہے جو کسی اور سے پُر نہیں ہو سکتا اور جس کے بغیر سماج میں ایسے جراثیم پیوست ہو جاتے ہیں جو اس کے دشمن ثابت ہوتے ہیں یہ بحث جس قدر نفیس و شاندار ہے اسی قدر علمی اور تفصیل طلب ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے (جاری ہے)

سوئے (حدیث پاک) اور اجتماعی طور پر پورا محلہ یا بستی کے لوگ اس امر کے قانونی طور پر ذمہ دار ہیں کہ ان کی حدود میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جس کی معاشی احتیاجات پوری نہ ہوں۔ اور اگر ان کے اس فریضہ کی عدم ادائیگی کی وجہ سے کوئی شخص کسی بستی میں بھوکا (یا بے علاج) مر جائے تو اس کی دیت بستی والوں پر واجب ہے۔ موجودہ دور میں لوکل باڈیز کو قانونی طور پر یہ ذمہ داری دی جانی چاہیئے۔ فی الحال تو ان کی ذمہ داری صرف لاوارث لاشوں کو فٹ پاتھوں سے اٹھانا ہے، زندہ لاوارث لوگوں (یعنی ایسے لوگ جن کے خاندان والے، رشتہ دار، قریبی ہمسائے ان کی کفالت کا فریضہ ادا کرنے میں ناکام رہیں) کی ذمہ داری بھی انہی لوکل باڈیز کے سپرد کی جانی چاہیئے۔ اگر فنڈز کا مسئلہ ہو تو صوبائی یا مرکزی حکومت یا زکوٰۃ کونسل اپنے اپنے وسائل سے ان لوکل باڈیز کی اس خاص ضمن میں مدد کر سکتے ہیں۔

چوتھا دائرہ ریاست۔ ایسے مستحقین جن کی مذکورہ بالا تینوں سطحوں پر کفالت نہ ہو رہی ہو۔ بدرجۂ آخر ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کی کفالت کا انتظام کرے جیسا کہ ارشاد عالی ہے۔ اَنَا وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَہٗ اسی طرح ایسے افراد کی فوتیدگی کی صورت میں ان کے معاشی واجبات (مثلاً قرض وغیرہ) کی ذمہ داری بھی ریاست کی ہے جب کہ یہ ذمہ داری ان کے اہل خاندان، رشتہ دار، ہمسائے اور بستی والے پورا کرنے سے کوتاہی کریں۔ یہاں پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ صنعتی دور میں، سماجی اکھاڑ پچھاڑ، خاندانی نظام کے انتشار اور ترکِ سکونت کے روز افزوں رجحانات اور URBANISATION (دیہات سے شہروں کو نقل مکانی) کی وجہ سے ایسے افراد کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو صحیح معنوں میں کس مپرس ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا اور نتیجۃً ریاست کی کفالت کا دائرہ اب وسیع سے وسیع ہوتا جا رہا ہے دوسرے الفاظ میں، دورِ جدید کی ریاست کی ذمہ داریاں کفالت کے سلسلے میں اب زیادہ سے زیادہ ہوتی جا رہی ہیں۔ اس رجحان کی کچھ اور وجوہ بھی ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے بہر حال ایسے کس مپرس، بے آسرا، اور غیر مکفول لوگوں کی کفالت کے انتظام سے کوئی اسلامی ریاست اگر کوتاہی کرے گی تو فی الواقع وہ اپنا ایک شرعی فریضہ پورا کرنے سے کوتاہی کر کے ان لوگوں کو غیر اسلامی معاشی نظاموں کے لیے ایک بنا بنایا چارہ یا FOODER کے طور پر مہیا کرنے کے ناقابل معافی جرم کی مرتکب ہوگی۔

(۳) اہلیتِ کسب وسعیِ کسب کے لیے مساواتِ مواقع

اگرچہ اسلام مساواتِ مطلق کا قائل نہیں ہے کہ فطرت میں اس قسم کے مظہر (PHENOMENON) کا کوئی وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔ لیکن اسلام میں اخوت کا تصور بہر حال ہے اور جیسا کہ ہر اچھے گھرانے میں

ہوتا ہے اسلامی معاشرہ کے خاندان میں بھی اس امر کی لازماً کوشش کی جانی چاہیئے کہ ابتداءً ہر فرد کو کسب کا اہل بننے کے لیے ایک جیسے مواقع مہیا کیے جائیں (اس اصول کا تقاضا تعلیم میں مساواتِ مواقع ہے اور ایک ہی ملک وملت میں مختلف قسم کے نظام ہائے کی تعلیم کی نفی ہے) نیز کسب کے لیے ہر فرد کے لیے میدان ایک جیسا کھلا ہو اور اس میں حلال وحرام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جہاں تک کوئی بڑھنا چاہے بڑھ سکے (اس اصول کا تقاضا اجارہ داریوں (MONOPOLIES) کی نفی ہے)

کسب کے لیے اہل بنانا اور کسب کے لیے مواقع اور JOBS کی بہم رسانی اور ان تک کھلی رسائی اسلام کے اس منشاء کے بھی عین مطابق ہے جس کا ذکر بالا ہوا۔ اس سلسلہ میں وہ واقعہ بالخصوص قابلِ ذکر ہے جس میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیت المال سے کچھ دینے کی بجائے ان کے اپنے اثاثہ (کمبل) کو خود نیلام فرما کر اس کے لیے کلہاڑی اپنے دست مبارک سے تیار فرمائی اور اس طرح سے انہیں کسبِ حلال کے اہل بنا کر انہیں عیالاً علی المسلمین اور بیت المال پر بوجھ بننے سے روکا ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد کو کسب کے اہل بننے اور پھر کسب کرنے کے لیے مساواتِ مواقع EQUALITY OF OPPORTUNITY مہیا کرنے کا انتظام کر دیا جائے تو پھر کفالتِ عمومی کے اداروں پر، اس نسبت سے بوجھ کم سے کم تر ہو جائے گا۔ اور وہ نوبت آجائے گی کہ صدقہ دینے والا تو ہوگا، لیکن صدقہ لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ (جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ مبارک میں ہوا!

معاشی عمل کے ہر مرحلہ کے لیے حلال وحرام کی حدود

اسلام میں معاشی فعالیت (ECONOMIC ACTIVITY) ایک ایسا کھیل نہیں جس کے کوئی قواعد یا RULES نہیں ہیں اور جس میں ہر کھلاڑی جس طرح سے چاہیے بغیر کسی سزا کے فاؤل (FOUL) کر سکتا ہے نہ ہی یہ ایک ایسا کھیل ہے جس کے میدان کی کوئی باؤنڈری لائن نہ ہو، کوئی حد بندی نہ ہو۔ اسلام میں کسب کے مرحلہ پر، پھر صَرف (CONSUMPTION) کے مرحلہ پر اور پھر بچت شدہ مال (SAVING) کے استعمال کے سلسلہ میں چند واضح اور کھلی کھلی ہدایات ہیں جو یہ طے کرتی ہیں کہ کمائی کی حدود کون کون سی ہیں۔ اور کس قسم کی کمائی ہے جسے چھونے کا ایک مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا، پھر اس کمائی کو خرچ کرنے کے سلسلہ میں کون کون سی حدود ہیں جن کو توڑنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ اور آخر میں بچت شدہ رقوم کے سلسلہ میں کچھ واضح ارشادات ہیں بالخصوص اکتناز کی حُرمت، سُود کی حرمت، اور سال گذرنے پر ۲½ فیصد زکوٰۃ۔ گویا معاشی کارکردگی میں مادر پدر آزادی نہیں ہے اور مذکورہ بالا تینوں مرحلوں (کسب صَرف اور بچت) میں سے ہر ایک

ہیں اسلام دخل دیتا ہے اور بتایا ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام۔ مغربی سرمایہ داری اور اسلام میں ایک بنیادی فرق یہی حلال و حرام کا ہے۔ سرمایہ داری میں کسی مرحلہ پر کوئی پابندی نہیں ہوتی سرمایہ دارانہ معاشرہ دراصل انسانی معاشرہ ہوتا ہی نہیں ہے یہ ایک جنگل ہے جہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول (یا بے اُصولی) کارواج ہوتا ہے اور معاشی طور پر زیادہ طاقت ور افراد کو اس بات کی کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ سماجی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے روپے کے زور پر جیسے چاہیں کھیل کھیلیں.... اس کے برعکس... اسلامی معاشرہ ایک انسانی معاشرہ ہوتا ہے، ایک بھائی چارے کا معاشرہ ہوتا ہے، ایک خاندان ہوتا ہے جس میں اپنی اپنی اہلیت، صلاحیت، ذوق اور کارکردگی کی بنا پر معاشی تفاوت تو ہوتا ہے مگر یہ تفاوت اس بات کا جواز نہیں ہوتا کہ معاشرہ کے معاشی وسائل کو غیر سماجی انداز میں بڑھایا جائے (مثلاً احتکار کے ذریعہ یا سُود کے ذریعہ) یا غیر سماجی انداز میں صرف کیا جائے (مثلاً اسراف و تبذیر صرفِ نمائشی۔ محل اور مقبرے وغیرہ۔)

ایک ایسی ریاست جس میں ذاتی ملکیت کی تو اجازت ہو مگر حلال و حرام کی پابندیاں سختی سے نافذ نہ کی جائیں صریحاً غیر اسلامی اور سرمایہ دارانہ ریاست ہے۔ اسلامی ریاست کا ایک ذمہ یہ اُس سخت گیر اور منصف ریفری (REFREE) کا ہے جو جب بھی کسی کو کھیل میں فاؤل (FOUL) کرتے دیکھتا ہے (اس سیاق و سباق میں جب بھی کوئی فرد، ادارہ کسب، صرف، یا بچت کے مرحلہ پر حرام مشاغل میں ملوث ہوتا ہے) تو ایسے کھلاڑی کو کان سے پکڑ کر کھیل کے میدان سے باہر نکال دیتا ہے اگر کوئی ریاست ایسا نہیں کرتی تو اسے بہر حال اسلامی ریاست کہلانے کا کوئی حق نہیں اور ایسی ریاست محض سرمایہ داری کے گندے کھیل کو جاری رکھنے کی ایک بے جواز اور غیر اسلامی اور انجام کار ناکام کوشش ہوتی ہے اور موجودہ حالات میں یہ ایک ایسی کشتی ہے جو آج ڈوبی کہ کل ڈوبی، اور اپنے ساتھ پتہ نہیں کس کس کو لے ڈوبے (علاوہ امتِ اسلامیہ کے اسلام کے نام نیک کو بھی)

(۵) ارتکازِ زر کی حوصلہ فرسائی

جیسا کہ سورۃ حشر کی آیت نمبر سات میں مذکور ہے اسلام ارتکازِ زر کے سخت خلاف ہے اور وہ تمام پالیسیاں جن سے امیر، امیر تر اور غریب سے غریب تر ہوتے جائیں، اُن کے غیر اسلامی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ ایک نہایت ہی بنیادی اصُول ہے اور اس سے اسلامی معاشرہ میں دولت کے بہاؤ کا رُخ متعین ہوتا ہے اسلامی معاشرہ میں اصُول یہ ہے کہ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَتُرَدُّ اِلٰى فُقَرَآئِهِمْ ریاست کا کام یہ ہے کہ وہ دولت مال داروں سے لے اور محتاجوں کو واپس کرے (یہاں

پر "نزدُ" کا لفظ قابلِ غور ہے اور اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ استحصال کا تصور اور اس کی تلافی کے لیے اقدامات تجویز کرنا اور ان پر عمل کرنا کوئی ایسی بات نہیں ہے جو دورِ جدید کے مفکرین کی اجارہ داری ہے) اگر کسی معاشرہ میں بالغرض یوں ہوتا ہے کہ دولت غریبوں سے لے کر دولت مندوں کے مفاد میں صرف کی جائے تو اس معاشرہ کے غیر اسلامی ہونے میں کوئی احمق یا جاہل یا بدنیت شخص ہی شبہ کر سکتا ہے۔ دولت کے بہاؤ کے اس غیر اسلامی رخ کی ایک مثال وہ پبلک سکول ہیں جنہیں سرکاری خزانہ سے امداد ملتی ہے لیکن عملی طور پر وہاں امراء کے بچے ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ اسلامی اصولوں کی دوہری خلاف ورزی ہے (دوسرا اصول جس کی خلاف ورزی ہوتی ہے وہ تعلیم میں مساواتِ مواقع کا اصول ہے جس کا ذکر نمبر ۳ بالا میں کیا گیا)

(۶) مال کے ضیاع کی نہی

عام تصور کے خلاف اسلام میں مال و دولت کی بڑی اہمیت ہے اور اسے زندگی کے قیام کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مال و دولت کی پیداوار بڑھانے کی ترغیب دی گئی ہے (نمبر ۱ بالا ملاحظہ ہو) اور ساتھ ہی ساتھ اسے ضائع کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اور اس ضیاع کو روکنے کے لیے اسراف و تبذیر اور صرفِ نمائشی (مثلاً بلا ضرورت تعمیر جیسا کہ قومِ عاد[1] کے سلسلہ میں ذکر ہوا نیز پختہ قبریں اور مقبرے، مردوں کے لیے سونا چاندی اور ریشم، سونے چاندی کے برتن، یہ صرف چند مثالیں ہیں اور ان سے ملتا جلتا صرف ہر عہد اور ہر زمانہ میں حرام قرار دیا گیا ہے)

دراصل اسلام مال کی سماجی نوعیت کا قائل ہے اور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کہے کہ پیغمبر کون ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے مال میں من مانی کرنے سے روکے (اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا)[2]

یہاں پر ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ حرام خوری اور مال کے ضیاع یا اسراف میں ایک گہرا تعلق ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ؏ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔ اگر حلال و حرام کی حد بندیوں کو توڑنے کی اجازت نہ دی جائے تو اسراف و تبذیر بڑی حد تک ختم ہو جائیں۔

مال کے ضیاع کو روکنے کے لیے اسلام کو جو اصرار ہے اس کا ایک پہلو یہ ہدایت بھی ہے کہ احمق لوگ جن سے یہ خطرہ ہو کہ وہ مال کا مناسب انتظام کرنے کے نااہل ہوں تو ان کی اپنی ملکیت کا مال بھی ان کے زیرِ تصرف نہ دیا جائے[3] (وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ) یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ مال کی ملکیت ان

---

[1] (سورۂ شعراء، آیت نمبر ۱۲۸) [2] (سورۂ ھود، آیت نمبر ۸۷)

[3] (سورۂ نساء، آیت نمبر ۵)

سفہاء کی ہے لیکن آیت مبارکہ میں اموالکم کی ترکیب استعمال کی گئی ہے اموالہم کی ترکیب نہیں۔ اور یہ بات اس امر کی دلالت کرتی ہے کہ اگرچہ اس ملکیت کا ایک پہلو ذاتی ہے لیکن اس کا ایک سماجی اور اجتماعی پہلو کو زیادہ اہم سمجھتے ہوئے قرآن نے اموالکم فرمایا، اموالہم نہیں فرمایا۔ اس سے فقہا نے یہ استخراج کیا ہے کہ اگر کوئی صاحبِ مال اپنے مال کے انتظام اور صرف میں سفاہت کا مظاہرہ کرے تو امام کو (ریاست کو) یہ حق ہے کہ اُس کے حقوقِ ملکیت وقتی طور پر معطل کر دے۔

(۷) مادی، مالی اور انسانی وسائلِ پیداوار میں رفعِ تعطل

اسلام اس بات کا انتظام کرتا ہے کہ معاشی وسائل معطل نہ پڑے رہیں مثلاً ایسا نہ ہو کہ ایسی زمین جس میں کاشت ہو سکتی ہے بغیر کاشت کے پڑی رہے۔ اگر کوئی ایسا شخص جس کے قبضہ میں زمین ہو اور وہ مسلسل تین سال تک اس سے کاشت نہ کرے تو امام کو (ریاست کو) یہ حق ہے کہ وہ اپنی سطح پر اس زمین کے تعطل کے رفع کرنے کا انتظام کرے یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ تین سال کی مدت یا اس حکم کے ضمن میں صرف زمین کا ذکر ہوا۔ دراصل اس خاص اصول کے ایک اطلاق کا ذکر ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں یہ مدت شوریٰ سے کم و بیش کی جا سکتی ہے اور اس حکم کا اطلاق پیداوار کے دیگر سرچشموں مثلاً کارخانوں وغیرہ پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ اشیائے صرف مثلاً غلہ، کپڑا وغیرہ کو معطل رکھا جائے یا ان کا احتکار کیا جائے یا سرمائے کا احتکار کیا جائے۔ اس مظہر کو اسلام میں اکتناز کی اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں شاید سب سے زیادہ ناپسندیدہ امر انسانی وسائل پیداوار کا تعطل ہے یعنی لوگ کام کرنے پر راضی اور تیار ہوں لیکن انہیں کام نہ ملے اور روزگار یا JOBS نہ مہیا کی جائیں۔ یا یہ کہ لوگوں کو پیداواری عمل میں شرکت کے لیے کسی خاص زمانہ میں جن تکنیکی اہلیتوں (Technical Skills) کی ضرورت ہے انہیں اس کی تربیت کے مواقع مہیا نہ کیے جائیں اور وہ غیر پیداواری یا نیم پیداواری زندگیاں گذارنے پر مجبور ہوں اس طرح سے وہ خود اپنے لیے ایک عذاب اور ملک و ملت کے لیے ایک بوجھ ثابت ہوں۔ نالائقی کی انتہا یہ ہے کہ جو چیز اثاثہ (Asset) بن سکتا ہو اسے ذمہ داری یا بوجھ (Liability) بنا لیا جائے۔

(۸) العفو کا انفاق

العفو کا ذکر جب کیا جاتا ہے تو عام طور پر وہ نقطۂ نظر ملحوظ ہوتا ہے جس کو روائتی طور پر حضرت ابوذر

غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ حالانکہ خود ان کے پاس اتنا اثاثہ ضرور ہوتا تھا جس سے ایک کم از کم مدت تک ان کی اور ان کے اہلِ و عیال کی گذر بسر ہو سکے۔ العفو کے معانی کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو قرونِ اولیٰ میں واجبات (TAXES) وصول کرتے وقت ملحوظ رکھا جاتا رہا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ واجبات صرف ان لوگوں سے اور اس حد تک وصول کیے جائیں کہ پھر بھی ان کے پاس ان کے لیے اور اہلِ و عیال کی گذر اوقات کے لیے باقی رہ جائے۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو ہدایات محصلین کو دیں اور جن پر پھر متعلقہ علاقہ کے قابلِ اعتبار افراد سے سال کے سال بالالتزام گواہی لی جاتی تھی وہ اس اصُول کے نفاذ کے سلسلہ میں بڑی واضح ہیں۔ گویا اسلامی حکومت اس کی پابند ہے کہ ٹیکس لگاتے وقت اور وصُول کرتے وقت العفو کے اصُول کی پابندی کرے۔ اور جب اسلامی حکومت کے مصارف روایتی طریقہ (یعنی زکوٰۃ وغیرہ) سے پورے نہ ہوں۔ اور ان کے علاوہ واجبات یا ٹیکس لگانے کی ضرورت پیش آئے تو جس کے پاس العفو جتنا زیادہ ہو اتنا اس سے زیادہ وصُول کیا جائے اور بالعکس موجودہ زمانے کی اصطلاح میں یہ اصُول متزائد ٹیکس (Progressive Taxation) کے لیے ایک جواز اور بنیاد ہے۔

اس سلسلہ میں یہ اَمر بھی قابلِ ذکر ہے کہ العفو کی مقدار کا ایک طرف سے تعلق متعلقہ فرد کی ایمانی کیفیت سے ہے (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال، جنگِ تبوک کے موقع پر) اور دوسری طرف یہ تعلق اِن مخصوص حالات سے بھی ہے جس میں سے ملک و قوم اس وقت گذر رہے ہوں ہنگامی قسم کے حالات میں جب قومی اور ملی ضروریات زیادہ شدید ہوں اور ملت کی بقا خطرے میں ہو۔ العفو کی مقدار کا تعین اور طرح سے کیا جائے گا اور معمول کے حالات میں اور طرح سے۔

(۹) کسب کا سعی کے ساتھ مشروط ہونا

اگرچہ ہمارے بعض مفسرین نے بڑا زور اس امر پر مارا ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی[سہ] کا اصُول معاشی امُور میں غیر متعلق ہے لیکن فی الحقیقت یہ کوشش ایک عمومی بیان کو غیر ضروری طور پر اور بے جواز طور پر محدود کرنے کے مترادف ہے اس سلسلہ میں فے اور غنیمت کے احکام کا تقابل واضح کر دیتا ہے کہ اسلام فی الواقع کسب، اور سعی کو بالکل غیر متعلق یا باہمدگر بالکل غیر مشروط نہیں سمجھتا۔ 'فے' ساری کی ساری بیت المال کا حصہ ہوتی ہے کیونکہ اس کے حصُول میں غازیوں کا کوئی زور نہیں لگا ہوتا۔[لہ] (مَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ)

سہ (سورۃ النجم۔ آیت نمبر ۳۹)

لہ سورۂ الحشر۔ آیت نمبر ۶۔

اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ جس حد تک کوئی مال بغیر سعی کے حاصل ہو اس حد تک وہ بیت المال کی ملکیت ہے موجودہ دور میں گین ٹیکس (Gains Tax) اس اصُول کا ایک اطلاق ہے شوریٰ کے ساتھ کوئی معاشرہ ان دوائر کا تعین کر سکتا ہے جہاں انفرادی سعی کے بغیر ہی کوئی مال حاصل ہو رہا ہو اور اس طرح سے اِس خاص حد تک وہ مال کِسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ بیت المال کی ملکیت ہوگا۔(بارانی زمینوں کی پیداوار میں عشر کی شرح کا دگنا ہونا نیز دفینہ میں بیت المال کے واجبات کا ۲½ ٪ کے بجائے ۲۰ ٪ ہونا۔ اسی اصُول کے اطلاق کی دو اور مثالیں ہیں)

کسب وسعی کو غیر متعلق ثابت کرنے کے لیے بعض اوقات اسلام کے نظامِ وراثت کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے دو باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ایک تو یہ وارث اور مورث دراصل ایک دوسرے کی (خون کے رشتے کے ناطے پر) حیاتیاتی توسیع (Biological Extention) ہی ہوتے ہیں اور ان میں من تو شدم تو من شدی کا رشتہ ہوتا ہے اور ایک کی سعی دوسرے کی بھی سعی ہوتی ہے (بلکہ دوسرے کے لیے ہی ہوتی ہے اور انفرادی کوشش کے لیے ایک مہمیز یہی خونی تعلق اور اپنے ورثا کو بہتر معاشی حالت میں چھوڑ جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ کیونکہ حیاتیاتی طور پر وہ ایک ہی ہوتے ہیں) اور دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کا نظامِ وراثت دراصل اسلام کے نظامِ کفالت کی ایک خاص صورتِ حال میں ایک خصوصی شکل ہے۔ ایسے ہی دیگر مستحقین کو جب اسلام کے نظامِ کفالت کے تحت (اس صورت میں اسلامی اخوت کے ناطے یا غیر مسلموں کی صورت میں انسانی بھائی چارے کے حوالے سے) کچھ مال دیا جاتا ہے تو اس سے یہ استشہاد کرنا کہ اسلام میں سعی وکسب غیر متعلق ہیں۔ اسلام کے معاشی فکر کو اس کے مجموعی تناظر میں دیکھنے سے ناکام رہنے کی ایک افسوسناک مثال ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں ——— !

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم

علمی تجرّ، اعتدال اور فقہی توسّع کی حامل شخصیت

——— (از قلم: حافظ صلاح الدین یوسف، ایڈیٹر "الاعتصام" لاہور) ———

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر ماہنامہ "برہان" دہلی، جن کا انتقال رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ (مئی ۸۵ء) کو کراچی میں ہوا، برصغیر پاک و ہند کی ملّتِ اسلامیہ کے نامور عالم، بلند پایہ مُصنّف اور صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز تھے۔ ان کی علمی و دینی اور تدریسی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ، علی گڑھ یونیورسٹی دہلی اور دیگر جگہوں پر مدرس اور لیکچرار بھی رہے۔ صدیقِ اکبر، عثمان ذوالنورین، وحی الٰہی، فہم قرآن اور اسلام میں غلامی کی حقیقت جیسی وقیع اور اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور پاک و ہند کے اہم علمی مجلہ "برہان" دہلی کے تقریباً نصف صدی سے مدیر چلے آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی اور بین الاقوامی اجتماعات میں بھی شریک ہوتے اور اپنے علمی مقالات اور فاضلانہ تقاریر سے اسلام کی نمائندگی اور ملّتِ اسلامیہ کی ترجمانی کا فریضہ بھی نہایت اخلاص اور دردمندی سے ادا کرتے رہے۔ اس لحاظ سے وہ بلاشبہ ایک متنوع اور بوقلموں شخصیت کے حامل تھے اور اپنی گوناگوں خدمات کی وجہ سے پاک و ہند کی چند نمایاں، ممتاز اور سربرآوردہ شخصیات میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

تدریسی خدمات کی وجہ سے ان کا حلقۂ تلامذہ و مستفیدین بھی کافی وسیع ہے۔ اور علمی و دینی خدمات کی بنا پر اہل علم و فضل میں بھی خوب متعارف ہیں اور مجھ جیسے کج مج بیان اور ان کے خوانِ علم کے ریزہ چین بیشمار لوگ بھی ان سے عقیدت و ارادت کا تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے تعلق اور ارادت کے مطابق ان کی بارگاہ میں گُل ہائے عقیدت اور ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کریں گے جس سے یقیناً ان کی سیرت و شخصیت کے نقوش اُجاگر اور ان کی متنوع خدمات کے گوشے واضح ہوں گے جو نسلِ نو کے لیے دلیلِ راہ اور سنگ ہائے میل ثابت ہوں گے۔

راقم خاکسار بھی ان کی شخصیت کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔ ایسا پہلو جو راقم کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور شاید اس کی طرف کسی اور کی توجہ گرامی اُس طریقے سے مبذول نہ ہو سکے جس کا وہ مستحق ہے، اور وہ پہلو ہے اختلافی مسائل اور فقہیات میں ان کا اعتدال و توازن، وُسعت و رواداری اور فقہی

جمود سے پاک ہونا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ وہ دیوبند کے فاضل تھے اور آخر دم تک اُس سے وابستہ رہے لیکن اس کے باوجود وہ حنفیت میں اتنے متصلب اور غُلو پسند کبھی نہ رہے جو حلقۂ دیوبند کے وابستگان کا بالعموم طرۂ امتیاز ہے۔ وہ بلاشبہ حنفی تھے اور حنفی رہے لیکن بہت سے مسائل میں انہوں نے حنفیت کے مقابلے میں نصوصِ قرآن و حدیث کو ترجیح دی اور بلا تأمل حنفی فقہ کو نظر انداز کر دیا۔

جس طرح مجلس واحد کی تین طلاقوں کا مسئلہ ہے، اس میں انہوں نے دلائل کی رُو سے حنفی فقہ کے مقابلے میں حافظ ابن القیم اور امام ابن تیمیہ کے مسلک کو ترجیح دی ہے جس کے حامل پاک و ہند کے اہلحدیث بھی ہیں۔ انہوں نے یہ دلائل اس امر پر زور دیا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاقِ رجعی شمار کرنا چاہیئے تاکہ حلالہ جیسے لعنتی فعل اور دیگر معاشرتی خرابیوں سے بچا جا سکے۔ مولانا مرحوم کا یہ فاضلانہ مقالہ ــ ایک مجلس کی تین طلاق ــــ نامی کتاب[1] میں چھپا ہوا ہے اور اس قابل ہے کہ دیگر حنفی علماء بھی سنجیدگی سے اس کا مطالعہ فرمائیں اور پورے اخلاص سے اس مسئلے کو اسی تناظر میں دیکھیں جس میں مولانا اکبر آبادی مرحوم نے دیکھا تھا۔

فقہ حنفی کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ دارالحرب میں مسلمانوں کا کافروں سے سُود لینا جائز ہے، مولانا اکبر آبادی ۱۹۶۴ء میں مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ کی کانفرنس میں تشریف لے گئے اور وہاں کے علمی مباحث میں حصہ لیا، جس کی مختصر رُوداد انہوں نے ماہنامہ "برہان" دہلی میں خود اپنے قلم سے لکھی تھی۔ اس کانفرنس میں بنک کے سود پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی اس میں شیخ ابوزہرہ مرحوم نے بنک کے سُود کی حُرمت پر بڑی زوردار تقریریں کیں۔ لیکن شیخ نے فقہ حنفی کا مذکورہ مسئلہ بھی اپنی ایک تقریر میں ضمنی طور پر بیان فرمایا اور کہا کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حربی اور مسلم میں ربٰوا نہیں ہے یعنی وہ جائز ہے۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں۔

"اس سلسلے میں میں نے ایک مختصر تقریر کی اور اس میں کہا کہ اگر امام صاحب کی طرف اس قول کا انتساب صحیح ہے تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ جب قرآن میں وَحَرَّمَ الرِّبٰوا عام اور مطلق ہے تو کسی نص یا حدیث متواتر کے بغیر اس کی تخصیص اور تقیید کس طرح جائز اور درست ہو سکتی ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ائمہ اور فقہاء اس بات

---

[1] یہ کتاب پہلے ہندوستان میں چھپی تھی، اس کے بعد لاہور (پاکستان) میں بھی چھپ گئی ہے۔

میں اختلاف کر سکتے ہیں کہ فلاں معاملہ ربوٰا کے تحت میں آتا ہے یا نہیں؟ لیکن اگر کسی معاملے کی نسبت یہ ثابت ہو جائے کہ ربوٰا کی تعریف اس پر صادق آتی ہے تو اب دنیا میں کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ معاملہ جائز ہے۔" ("برہان" دہلی اگست ۱۹۶۵ء ص۱۱)

اسی طرح حرمتِ مصاہرت اور طلاقِ مکرہ کا مسئلہ ہے جس میں مولانا اکبر آبادی مرحوم نے فقہ حنفی سے اختلاف کیا اور شوافع اور ائمہ ثلاثہ کی رائے کو ترجیح دی۔ چنانچہ مولانا نے ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن ایڈووکیٹ کی مرتبہ کتاب "مجموعۂ قوانینِ اسلام" کی جلد اوّل، دوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"حرمتِ مصاہرت کے باب میں ہمارے نزدیک شوافع کا مسلک عملاً اقرب الی الصواب ہے اور امام ابوحنیفہؒ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ غایتِ ورع اور تقویٰ کی بات ہے۔ اسی طرح طلاقِ مکرہ کے معاملے میں ائمہ ثلاثہ کی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔"

("برہان" دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء، صفحہ نمبر ۲۴۸)

علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس کتاب کی بھی انہوں نے اسی لیے خوب تحسین کی کہ اگرچہ انہوں نے اکثر و بیشتر ائمہ احناف کا تتبع کیا اور ان کی رائے کو ترجیح دی ہے لیکن متعدد مقامات ایسے بھی ہیں جہاں دوسرے ائمہ کی رائے کو اقرب الی الصواب یا الیسر العمل قرار دیا ہے (حوالۂ مذکور)

اسی طرح "دیارِ غرب کے مشاہدات و تأثرات" میں مولانا مرحوم نے تسمیہ عند الذبح کے مسئلے میں امام شافعیؒ کے قول کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ اس کی تائید روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ (ملاحظہ ہو "برہان" دہلی۔ فروری ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۱۴-۱۱۵)

عورتوں کا مساجد میں جا کر نماز پڑھنا وغیرہ بھی فقہ حنفی کی رُو سے صحیح نہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک مسلم زنانہ کالج میں جب مسلمان خواتین کے نماز پڑھنے کے لیے وہاں ایک مسجد کا قیام عمل میں لایا گیا تو بہت سے لوگوں نے اس پر شور مچایا۔ اس سے متأثر ہو کر ایک سلفی فاضل نے عورتوں کی امامت اور اُنکے مساجد میں نماز پڑھنے وغیرہ پر ایک مدلل مضمون لکھ کر "برہان" میں اشاعت کے لیے بھیجا، جسے مولانا مرحوم نے نہ صرف شائع کیا بلکہ اس پر ذیل کا نوٹ بھی تحریر فرمایا۔

"گزشتہ سال مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے مدراس کے ایک مسلم زنانہ کالج میں ایک نہایت شاندار مسجد کا افتتاح کیا تو بعض شورش پسندوں نے اس پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور انہوں نے کہا کہ عورتوں کے لیے نہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کا حکم ہے اور نہ ان کے لیے امامت اور خطبہ دینا جائز ہے۔ یہ ہنگامہ صرف زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں رہا بلکہ

اُردو کے بعض ذمہ دار اخبارات میں اِس نوع کی تحریریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ اسی واقعے سے متأثر ہوکر ہمارے فاضل دوست مولانا محمد یوسف صاحب (کوکن عمری) نے جو جنوبی ہند کے اکابر علماء میں سے ہیں، پیشِ نظر مقالے میں اس موضوع پر مفصل اور بصیرت افروز بحث کی ہے جسے ہم شکریے کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔" ("برہان" دہلی فروری، ۱۹۶۷ء صفحہ ۶۹)

یہ مفصل اور فاضلانہ مقالہ جو "برہان" کے ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے، فقہ حنفی کے خلاف ہے لیکن مولانا نے اسے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ شائع فرمایا۔

اسی طرح اپنے مرض الموت میں وہ حنفی فقہ کے برخلاف جمع بین الصلاتین کا اہتمام فرماتے رہے۔

("معارف" اعظم گڑھ، جون ۱۹۸۵ء)

اس مختصر مضمون میں استقصا مقصود نہیں۔ یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئیں ہیں۔ ان مثالوں سے بہرحال ان کے اُس طرزِ عمل کی نشاندہی ہوجاتی ہے جو ہمارے اس مضمون کا موضوع اور مقصود ہے۔

مولانا مرحوم کا فقہی مسلک، ان کی اپنی تحریرات کے آئینے میں

پھر ان کا یہ طرزِ عمل کسی اضطراری تأثر یا وقتی ردِ عمل کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ان کے اندر فقہی جمود کی بجائے جو توسّع تھا، ان کی فکر و رائے میں جو اعتدال و توازن تھا اور ملّتِ اسلامیہ کو درپیش عصری مسائل کے حل کے لیے وہ ولولۂ بیتاب اور جذبۂ صادق رکھتے تھے، مذکورہ طرزِ عمل اس کا مظہر تھا۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ فقہی توسّع اور رواداری اور کسی ایک فقہ پر جمود و اصرار کی بجائے تمام اسلامی فقہی سرمائے سے استفادہ کیے بغیر موجودہ دور کے گوناگوں اور پیچیدہ مسائل کا حل ممکن نہیں، اس لیے انہوں نے فقہی توسّع کو بطور مسلک اپنایا اور برملا اس کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ وہ بنگلور (جنوبی ہند) کی ایک کانفرنس کی رُوداد لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "میں نے مسلم معاشرے میں پائے جانے والے رجحانات کا ذکر کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رجحانات تین قسم کے ہیں۔

(۱) قدامت پرستی (۲) ترقی پسندی (۳) آزاد فکری

اوّل الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کا خواہ کوئی مسئلہ یا کوئی معاملہ ہو، بہرحال اس کا حل کسی ایک خاص فقہی مسلک کی روشنی میں ہی تلاش کیا جائے، اور سرِمُو اس سے انحراف روا نہ رکھا جائے۔

(۲) اس کے بالمقابل ترقی پسندی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل قانون قرآن و حدیث میں ہے اور فقہی مسالک

کی حیثیت اس قانون کی تشریح وتوضیح کی ہے، وہ بجائے خود قانون نہیں ہے۔ اس بنا پر کسی جدید مسئلے کا حل اولاً براہ راست قرآن وحدیث میں دیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیئے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔ (۳) اب رہا تیسرا رجحان، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کو ماخذ تسلیم کرتا ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتا، پھر اپنے لیے قرآن کی آزاد اور بے قید وبند تفسیر وتوضیح کا حق بھی مانتا ہے۔ میں نے کہا کہ میرا تعلق دوسرے طبقے سے ہے اور یہی رجحان میرے نزدیک صحیح ہے۔" ("برہان" دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۳)

اسی طرح ایک اور موقع پر اپنے مسلک اور نقطۂ نظر کی وضاحت مولانا مرحوم اس طرح کرتے ہیں:

"راقم الحروف کا تصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دیوبند کا فیض یافتہ اور جمعیۃ العلماء کا ممبر اور قدردان ضرور ہے۔ لیکن اپنے دل ودماغ کو ہمیشہ کھلا اور آزاد رکھتا ہے اور کبھی کسی مسئلے پر جماعتی عصبیت اور تحزب کے ساتھ غور نہیں کرتا۔ اس بنا پر دارالعلوم دیوبند ہو یا ندوہ، جمعیۃ العلماء ہو یا اسلامی جماعت تبلیغی جماعت ہو یا دینی کونسل۔ ان سب اداروں کے اکابر اور کارکنوں کے خلوص، علم وفضل اور اسلامی حمیت وجوش کا دل سے معترف اور قدردان ہے اور یہ جماعتیں جو کام کر رہی ہیں، ان کی اہمیت وافادیت کا منکر نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان جماعتوں کی کسی رائے، کسی طریق کار اور یا کسی نظریے سے بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ ایمانداری سے اختلاف ہر انسان کا قدرتی حق ہے اور اُسے یہ حق استعمال کرنا چاہیئے۔ معاشرے کی شعوری صلاح وفلاح اسی پر موقوف ہے۔ پھر میں جس طرح کسی جماعت کو بھی تنقید سے بالا نہیں سمجھتا، اسی طرح کسی شخص واحد کو بھی، خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا امام اور شیخ وقت ہو، تنقید سے ماورا نہیں مانتا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ ارادت وعقیدت ادب واحترام اور تنقید واختلاف ان کے حدود کیا ہیں اور ان حدود میں رہ کر کس طرح ایک شخص دونوں کے مقتضیات ومطالبات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔"

("برہان" دہلی۔ نومبر ۱۹۶۲ء، ص ۲۶۰۔ از نظرات)

تلفیق بین المذاہب کی حوصلہ افزائی

مولانا مرحوم کا یہی وہ مسلک توسّع تھا جس کی وجہ سے وہ ہر اُس دعوت وتحریک کی حوصلہ افزائی

فرماتے جس میں فقہی رواداری ہوتی اور اس کی بنیاد کسی ایک فقہ پر جمود کی بجائے بلا امتیاز تمام فقہی ذخیروں سے استفادے پر ہوتی۔ چنانچہ پاکستان میں ڈاکٹر اسرار احمد بانی تنظیم اسلامی کی بھی انہوں نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بھی اگرچہ حنفی ہی ہیں، مگر ان میں فقہی جمود بہرحال نہیں ہے۔ اور انہوں نے یہ دعوت و تحریک پیش کی ہے کہ فقہ مذاہب اربعہ کے ساتھ ساتھ صحیح بخاری کو پانچویں فقہ شمار کر کے اجتہاد و استنباط کا کام کرنا چاہیئے۔ بنیادی طور پر اگرچہ یہ بات صحیح نہیں، اصولاً صحیح بخاری کو قرآن کریم کے بعد فقہ میں اساسی اور اولین حیثیت حاصل ہونی چاہیئے اور اس کی روشنی میں دیگر فقہوں سے استفادہ کیا جانا چاہیئے جس طرح کہ خود مولانا اکبر آبادی کا نظریہ بھی تھا جیسا کہ ان کے ایک اقتباس میں یہ بات گزر چکی ہے۔ تاہم چونکہ ڈاکٹر صاحب کی اس دعوت میں بھی ایک گونہ فقہی جمود سے انحراف تھا، اس لیے اگرچہ بیشتر علمائے اصناف نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس دعوت و تحریک کو سخت فتنے اور گمراہی سے تعبیر کیا لیکن مولانا اکبر آبادی مرحوم نے ڈاکٹر صاحب کی تائید کی اور تلفیق بین المذاہب کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا ہے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔

"ہمارے بعض متقدمین علماء نے تلفیق بین المذاہب کو استحسان کیا ہے اور اس کی ضرورت پر زور دیا ہے۔" (ماہنامہ "میثاق" لاہور، اگست ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۴)

مولانا سے مزید سوال کیا گیا کہ "ہمارے بعض علماء تو اس تلفیق کو بہت بڑی گالی خیال کرتے ہیں۔ گویا کہ ان کے نزدیک (تو) یہ درجۂ کفر تک پہنچی ہوئی بات ہے۔"

مولانا مرحوم نے اس کے جواب میں فرمایا۔

"ہمارے نزدیک تمام ائمہ فقہا سب برابر ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے (تلفیق بین المذاہب) کی ہے۔ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تک نے کی ہے۔ اس (تلفیق) کے بغیر تو چارا ہے ہی نہیں۔ اس کے بغیر ایک صحیح اسلامی ریاست چل ہی نہیں سکتی۔" (ماہنامہ "میثاق" لاہور، صفحہ ۱۴-۱۵، اگست ۱۹۸۵ء)

اسی انٹرویو میں مولانا مرحوم نے تبلیغی جماعت میں بڑھتے ہوئے تحزب اور اس لحاظ سے بعض بین الاقوامی شخصیات کی اس جماعت سے وابستگی پر اپنے دکھ اور تاسف کا بھی اظہار فرمایا ہے۔

علمائے احناف کے غلو فی الحنفیۃ پر سخت تنقید

مولانا اکبر آبادی مرحوم کے نزدیک فقہی اقوال و آراء کے مقابلے میں نصوص قرآن و حدیث کو جو برتری

حاصل تھی، اس کی وجہ سے وہ اُن غالی حنفی علماء کی کاوشوں پر بھی سخت تنقید کرتے جن میں حنفیت کا دفاع ایسے انداز سے کیا گیا ہوتا جس سے نصوصِ شریعت کا تقدس مجروح ہوتا یا اکابر محدثین کی بے توقیری ہوتی یا حدیث کی جمع و تدوین میں ان کی بے مثال کاوشوں اور بے لوث اور غیر جانبدارانہ سعی و جہد پر حرف آتا۔ ذرا دیکھئے! ایسے بعض غالی علماء کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے حق و انصاف کے تقاضوں کو کس طرح ملحوظ رکھا ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی کی عربی کتاب "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع ابن ماجہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اکبر آبادی مرحوم لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جگہ جگہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے مخالفین کی بحث اٹھا کر کتاب کو جدل و مناظرہ کا رنگ دے کر اس کی علمی حیثیت کو مجروح ہی نہیں کیا بلکہ خود حدیث کو معرضِ شک و ارتیاب میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض محدثین نے امام اعظمؒ کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے، لیکن اس کا جواب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان محدثین پر اسی طرح کے رکیک و سخیف حملے کیے جائیں جن سے ان کا کمالِ فن ہی داغ دار ہو جائے۔ اس سلسلے میں امام بخاریؒ، حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ذہبیؒ کی نسبت جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ حد یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے متعلق یہاں تک نقل کر دیا گیا ہے کہ وہ بر بنائے بغض و عناد امام ابوحنیفہ سے روایت نہیں کرتے، لیکن اس کے برخلاف ایسے مستور الحال لوگوں سے روایت کر دیتے ہیں جن کے متعلق بخاری جانتے بھی نہیں کہ کون تھے اور کون نہیں تھے؟" (ص ۲۸) اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ جوشِ انتقام میں صحیح بخاری کے راویوں کی عدالت اور اس کے اُمت کی طرف سے تلقی بالقبول کو متکلم فیہ قرار دے دیا ہے۔ فاضل مصنف خود سوچیں کہ کیا یہ وہی باتیں نہیں ہیں جو منکرینِ حدیث کہتے ہیں اور کیا امام بخاری کی عدالت، ثقاہت، تقویٰ و طہارت اور ان کی صحیح کی صحت کو مجروح کر دینے کے بعد بھی کسی اور کتابِ حدیث پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بعض متقدمین حنفیہ نے مجادلانہ طور پر امام بخاری، حافظ ابن حجر، ابن عدی اور حافظ ذہبی وغیرہم کے متعلق اس طرح کی باتیں ضرور لکھی ہیں۔ لیکن ایک محقق کا فرض ہے کہ علمی امانت و دیانت کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دے، اور غیظ و غضب میں کوئی بات ایسی نہ کہے جس سے دین کی اصل بنیاد میں ہی رخنہ پڑ جائے۔ اگر امام بخاریؒ بھی روایتِ حدیث ایسے اہم معاملے میں شخصی رضامندی یا ناراضمندی کو دخل

دینے سے محفوظ نہیں رہ سکتے تو پھر اس باب میں کسی اور پر کیوں کر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟
(ماہنامہ "برہان" دہلی۔ فروری ۱۹۵۶ء، ص ۱۲۷-۱۲۸)

اسی طرح ایک حنفی عالم نے حافظ ابن القیم کی کتاب "زاد المعاد" کا اردو ترجمہ جب اس انداز سے شائع کیا کہ حواشی میں جگہ بہ جگہ حنفیت کی پیچ میں حافظ ابن القیم کی تردید کو انہوں نے ضروری سمجھا، تو مولانا اکبر آبادی مرحوم نے اس پر حسب ذیل الفاظ میں تبصرہ رقم فرمایا۔

"..... ساتھ ہی کوئی چیز حنفی مسلک کے خلاف ہے تو اس کی تردید کر کے حنفی مسلک کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور گویا اس طرح انہوں نے خود اپنے قول "کتاب کو حنفی" کر دیا ہے (ص ۳) لیکن افسوس ہے اس سلسلے میں مصنف کے قلم کی تیز زبانی اور بے احتیاطی کا وہی عالم ہے جس کا شکوہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ چنانچہ ایک موقعے پر رقم طراز ہیں: "ابن قیم نے اس جگہ بلے پر کا کوا بنایا ہے"۔ (حصہ دوم ص ۲۲) یہ فقرہ صرف بطور نمونہ کے نقل کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ انداز بیان پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں موصوف کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ بہر حال حنفی مسلک کی تائید اور اس کی ترویج کرنا نہ علم کی خدمت ہے اور نہ دین کی"۔ ("برہان" دہلی، اپریل ۱۹۶۸ء، ص ۲۸۷)

اسی طرح مولانا عبد الرشید نعمانی کی اردو کتاب "ابن ماجہ اور علم حدیث" پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"مصنف کی رائے سے حنفیت میں ان کے شدتِ غلو کے باعث ہر جگہ اتفاق کرنا بھی ضروری نہیں ہے"۔ ("برہان" دہلی، جون ۱۹۶۲ء، ص ۳۸۳)

علمائے اہلحدیث کی اہمیت اور ان کی خدمات کا اعتراف

علمائے احناف بالعموم فقہی تعصب اور حزبی جانبداری کی وجہ سے علمائے اہلحدیث کی اہمیت و حیثیت کو بھی گھٹانے میں کوشاں رہتے ہیں اور ان کی ملی و دینی خدمات کے اعتراف میں بھی بڑا تامل اور بخل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مولانا اکبر آبادی مرحوم نے علمائے اہل حدیث کی حیثیت و اہمیت اور ان کی خدمات کا اعتراف بھی بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ہندوستان میں جماعت اہلحدیث کے علماء بھی بڑی اہمیت کے مالک رہے ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کی شرعی حیثیت کے بارے میں ان علمائے اسلام کی آراء

اس لیے اور بھی لائق توجہ ہے کہ اس جماعت نے ہی سب سے زیادہ سرگرمی اور جوش کے ساتھ حضرت سید احمد شہیدؒ کے زیر قیادت انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے میں حصہ لیا تھا اور اسی بنا پر انگریز انہیں بدنام کرنے کی غرض سے وہابی کہتے تھے۔"

("برہان" دہلی۔ اگست ۱۹۶۲ء، ص ۵۔ از "ہندوستان کی شرعی حیثیت")

مولانا مرحوم کی زیارت کا شرف

بدشعور سے راقم کے کانوں میں جن اکابر اہل علم کا نام پڑا اور ان کی علمی شہرت کا چرچا سنا، ان میں ایک مولانا اکبر آبادی مرحوم بھی تھے۔ پھر ان کی تصنیفات کے دیکھنے اور "برہان" کے وقتاً فوقتاً مطالعے سے ان کے ساتھ ارادت مندی بھی ہوگئی، جس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا رہا اور ان کی زیارت کا شوق دل میں انگڑائیاں لیتا رہا تا آنکہ گزشتہ سال مارچ (۱۹۸۴ء) میں مولانا مرحوم لاہور تشریف لائے تو راقم نے مولانا حامد میاں صاحب کے مدرسے جامعہ مدنیہ (کریم پارک لاہور) میں ملاقات کا شرف حاصل کیا، وہاں کچھ دیر ان کی علمی صحبت سے بھی فیض یابی کا موقعہ ملا۔ اس ملاقات میں راقم نے حضرت مولانا سے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وہ ہمارے ادارے — دارالدعوۃ السلفیہ کو بھی اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازیں، جس میں ایک بہترین علمی لائبریری بھی ہے، مولانا مرحوم نے بڑی خوش دلی سے اس دعوت کو قبول فرمایا اور دوسرے روز رات کو پروفیسر محمد اسلم صاحب اور مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی معیت میں تشریف لائے۔ افسوس ہے کہ راقم اس روز پہلے سے طے شدہ پروگرام کی وجہ سے کراچی چلا گیا۔ اور اس دوسری محفل کی سعادتوں سے محروم رہا۔ تاہم حضرت مولانا حسب وعدہ تشریف لائے، حضرت الاستاذ المحترم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف سے ملاقات فرمائی۔ جو چار سال سے بعارضہ فالج صاحب فراش چلے آرہے ہیں اور ادارے کی لائبریری اور دیگر شعبہ جات دیکھے اور بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ خیال تھا کہ حضرت مولانا پھر کبھی پاکستان تشریف لائیں گے تو دوبارہ اچھی طرح سے انہیں دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہو گی، کیونکہ پہلی مختصر سی ملاقات تو ؎

روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

کا مصداق تھی۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ اب ایسے سفر پر روانہ ہونے والے ہیں جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ دین وملت کے اس مخلص خادم کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے اور ان کی

(بقیہ صـ۶۹ پر)

نعتیہ شاعری کا انحطاطی پہلو

سلیم فاروقی

نعت اس مجموعۂ اشعار کو کہتے ہیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و محامد بیان کیے گئے ہوں، جب ہم نعت گو شعراء کا سراغ لگاتے ہیں تو سب سے پہلے نعت گو شاعر کی حیثیت سے جو شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے وہ صحابیٔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اس کے بعد عربی، فارسی، ہندی اور اردو میں لاتعداد ایسے شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی تمام تر شعری توانائی نعت لکھنے میں صرف کر دی، خاص طور پر فارسی اور اس سے کہیں زیادہ نعتیہ شاعری کا ذخیرہ ہماری اردو زبان میں موجود ہے۔ اگر آپ فی زمانہ جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ اس وقت بھی اُردو زبان میں نعتیہ شاعری کا تناسب عربی اور فارسی سے بہت زیادہ ہے۔

اُردو زبان میں جو لوگ نعت گو شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں ان میں غلام امام شہید، کرامت علی شہیدی محسن کاکوروی، بیدم شاہ وارثی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، حمید لکھنوی، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، ضیا بدایونی درد کاکوروی، حافظ مظہر الدین، ادیب سہارنپوری، عزیز حاصل پوری کے نام اس وقت ذہن میں آتے ہیں۔ جہاں تک اقبال اور ظفر علی خاں کا تعلق ہے تو ان بڑے شاعروں نے اپنی شاعری میں نعتیہ اشعار تو بہت کہے ہیں لیکن باقاعدہ کوئی نعتیہ مجموعہ مرتب نہیں کیا اس کے باوجود ان کے نعت گو شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

نعتیہ شاعری کے ضمن میں یہ بات بھی خلاف واقعہ نہیں کہ سرزمین عرب اور ایران سے زیادہ برصغیر پاک و ہند میں نعت خوانی اور نعتیہ شاعروں کا چرچا ہے، یہ واحد صنف شاعری ہے جس کی کانفرنسیں ہوتی ہیں، اکیڈمیاں قائم ہیں، اخبارات و جرائد نعتیہ شاعری کے ہر سال ربیع الاول کے موقع پر نہایت دیدہ زیب نمبر شائع کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بہت سے نعت گو شاعروں

اور نعت خوانوں نے اسے اپنا روزگار و پیشہ بنایا ہے۔ خصوصاً صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اس صنف سخن کی حوصلہ افزائی میں نمایاں حصہ لیا ہے، وہ جب کبھی ریڈیو یا ٹی وی پر کسی اہم مسئلہ پر قوم سے خطاب کرتے ہیں تو تلاوتِ قرآن حکیم کے بعد نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ضرور سنتے ہیں۔

اب اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ عام شاعری اور نعتیہ شاعری میں فرق کیا ہے۔ جیسا کہ آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ اصناف سخن میں غزل کو سب سے بلند مقام حاصل ہے فارسی اور اُردو میں معدودے چند ہی ایسے شاعر ہیں جن کے معیارِ تغزل کو درجۂ استناد حاصل ہے، غزل کا تعلق خالصتاً واردات عشق، ہجر، وصال، وغیرہ سے ہے، ظاہر ہے وصل و ہجر کی کیفیات عشق سے وابستہ ہیں اس لیے عشق غزل کی اساس و بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ عشق ہے کیا؟ عشق چونکہ عربی زبان کا لفظ ہے اس لیے عربی لغت میں اس کے معنی اس بے برگ و گل بیل کے ہیں جس کا رنگ پیلا ہوتا ہے اس بیل کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اسے کسی ہرے بھرے درخت پر ڈال دیا جائے تو قانون قدرت کے مطابق بڑی تیزی سے پھیل کر اس ہرے بھرے درخت کی ساری توانائی چوس کر اسے جھاڑ جھنکاڑ بنا دیتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ پھر اگر اس درخت پر سے اس بیل کو ہٹا بھی دیا جائے تب بھی درخت اس قابل نہیں رہتا کہ اسے اچھی سے اچھی کھاد اور پانی کے ذریعہ دوبارہ نشوونما کے قابل بنایا جائے۔

عاشق عشق کا اسم فاعل ہے اور اسکا اسم مفعول (مؤنث) معشوقہ ہے۔ لیکن لطف کی بات تو یہ کہ فارسی کی طرح اردو شاعری میں بھی معشوق کے لیے تذکیر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ ہماری عربی، فارسی اور اُردو شاعری کا عاشق اعظم قیس المعروف بہ مجنوں ہے جو لیلیٰ کے عشق میں چاک گریباں اور پابرہنہ نجد کے ریگزاروں میں ہائے لیلیٰ ہائے لیلیٰ کرتا پھرتا تھا یہ الگ بات ہے کہ واقعہ نویس اس ڈرامہ کے ہیرو کو آج تک تلاش نہ کر سکے۔

غزل کا سارا حسن محاسنِ شعری ہیں جن میں خاص طور پر تشبیہہ، استعارہ، حسن تعلیل، کنایہ، مجاز مرسل اور تلمیح ہیں، شاعروں نے وارداتِ عشق کے بیان میں کیسے کیسے زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں وہ ایک علیحدہ باب ہے اس وقت ہمارا موضوع نعتیہ شاعری ہے۔ غزل کی مذکورہ ہیئت ترکیبی کے بیان کے بعد آپ یہ دیکھیے کہ جس طرح غزل کی بنیاد دنیاوی عاشق و معشوق ہیں اسی طرح نعتیہ شاعری کی بنیاد عشقِ رسولؐ ہے۔ اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ قرآن حکیم

اور احادیث مبارکہ میں کسی جگہ "لفظِ عشق" استعمال نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ پہلے نعت گو شاعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنی کسی نعت میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ یہ لفظ سب سے پہلے ہمیں فارسی شاعری میں نظر آتا ہے ؎

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

اس موقع پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ جب عشق کا لفظ زمانۂ قدیم سے عربی لغت میں موجود ہے تو پھر صحابیٔ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے قادر الکلام نعت گو شاعر نے یہ لفظ اپنے اور رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقِ خاطر کے لیے کیوں نہ استعمال کیا؟ اس کا جواب صرف یہ ہے آنجناب اس لفظ کی معنوی خرابی سے واقف تھے اگر وہ اس کو اپنے اشعارِ نعتیہ میں استعمال کرتے تو اس کی معنوی تعبیر سے ایک عاشق کی جو شکل بنتی ہے وہ اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہوتی، خصوصاً اس سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مذہب کا تقدس باقی نہ رہتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین میں "حُبّ" کا لفظ استعمال کیا جس میں بڑی نفاست، لطافت اور اعتدال موجود ہے۔

اب آپ یہ غور فرمائیے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلقِ خاطر اور غیر معمولی محبت کے معاملہ میں صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن ان سیکڑوں صحابہ کرامؓ میں سے کیا کسی ایک صحابیؓ کی کوئی ایسی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ جس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی مبالغہ آمیز بات کہی ہو یا آپؐ کی جدائی میں عرب کے ریگزاروں میں پابرہنہ سر پیٹتا پھرا ہو؟

صحابہ کرامؓ پر سبقت لے جانے والے ایسے "نفوسِ قدسیہ" تو صرف ایران اور ہند و پاک ہی میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اردو اور فارسی کی نعتیہ شاعری میں ایسی نعتوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے جس میں نہایت گستاخانہ مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا دنیاوی حسیناؤں اور پری چہرہ دوشیزاؤں کی طرح بیان کیا گیا آپؐ کو "سراپا آفتِ دل" "رشکِ بتانِ آذری"، "لیلائے نجد"، لالہ رخسار، پری پیکر اور سرو قد تک کہا گیا ہے، شاعری میں تشبیہ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ کسی خاص وصف میں ایک چیز کو دوسری چیز کے مثل قرار دینا لہٰذا ہمارے نعت گو شاعروں نے ایسی تشبیہیں باندھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا مثل قرار دے دیا۔ اسی طرح مبالغہ کی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کو اتنا بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ہے کہ وہ جھوٹ کے مماثل ہو جائے، ہمارے نعت گو شاعروں نے اپنی نعتوں میں صنعتِ مبالغہ کو اسی طرح بیان

کیا ہے۔

رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و منصب کو سمجھنے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ قرآن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی زبان میں اپنے رسُولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ جب ہم نظم یا نثر میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کریں تو اعتدال کی راہ سے نہ بھٹکیں مثلاً از روئے قرآن اللہ تعالیٰ کے تمام جلیل القدر انبیاؑ و رسل علیہم السلام عصمت و بزرگی کے بہت بلند منصب پر فائز ہیں اللہ تعالیٰ اپنی کتاب مبین میں فرماتا ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ یعنی ان کے مقام و مرتبہ میں کوئی فرق نہیں لیکن پھر بھی "ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے" یعنی نبوّت و رسالت کے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے۔ اب اگر ہم اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر انبیاؑ و رسل کے مقام و مرتبہ کو نظر انداز کر کے یہ کہیں کہ ؎

شاہِ مدینہ یثرب کے والی
سارے نبی تیرے در کے سوالی

تو رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقابلی انداز میں تعریف خود آپؐ کی تعلیمات کے خلاف ہے احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انبیائے ماسبق کا ذکر بڑی عزت و احترام سے فرماتے تھے۔ ذرا سوچیے تو نبیوں اور پیغمبروں کو رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چوکھٹ کا سوالی اور حاجت مند کہنا کتنی بڑی گستاخی اور کتاب و سنّت سے ہٹی ہوئی بات ہے، کیونکہ حاجت روائی و مشکل کشائی صرف ربّ العزّت کو سزاوار ہے۔

ہماری نعتیہ شاعری میں جن عاشقانِ رسُول کا زور شور سے تذکرہ کیا جاتا ہے ان میں ایک اویس قرنی بھی ہیں جن کی یاد میں شعبان المبارک کے مہینہ میں حلوہ پکتا ہے، اس حلوہ کا افسانہ کچھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب اویس قرنی نے یہ سنا کہ فلاں غزوہ میں رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہوئے تو انہوں نے فوراً ایک پتھر سے اپنے سارے دانت توڑ لیے.... یہ ہے عشقِ رسُول جسے بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس غزوہ میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی تھے بلالؓ و ابوذرؓ بھی، وقاصؓ و سلمانؓ بھی اور طلحہؓ و زبیرؓ بھی لیکن ان جاں نثار صحابہ میں کوئی ایسا عاشقِ رسُول نہ تھا جو اپنا ایک دانت بھی توڑتا؟ عشقِ رسُول کا یہ مظاہرہ صرف اویس قرنی ہی کو کرنا تھا! جن لوگوں نے یہ داستان گھڑی شاید انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ اپنے جسم کو ایذا دینا نصِ قرآنی کے خلاف ہے اور وہ اسطرح کہ اپنی نبوت کے ابتدائی زمانہ

میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اتنی عبادت فرمانے لگے کہ آپؐ کے پیروں میں ورم ہو گیا (یعنی سوجن پیدا ہو گئی) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس عمل سے روکا۔

نعتیہ شاعری کے ساتھ ساتھ کچھ نعتیہ قوالی کا بھی ذکر ہو جائے، آج سے تیس چالیس سال قبل تک قوالی میں زیادہ تر امیر خسرو اور جامی کی نعتیہ غزلیں پڑھی جاتی تھیں لیکن اس کے بعد جب فلمی گانوں کا رواج ہوا تو قوالی میں بھی عمومیت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اب جو قوالیاں لکھی جا رہی ہیں وہ فلمی گانوں کی طرز پر، پھر ان میں وہ وہ خرافات بھری ہیں کہ سُن کر روح کانپتی ہے۔ مثلاً آج کل جس قوالی کا شہرہ ہے اس کے بول یہ ہیں ؎

آنکھ گلابی صلی اللہ کی
اللہ ہی جانے کون بشر ہے

آپ ذرا سوچیے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا کا بیان ہو اور "آنکھ گلابی" اور "نین کٹاری" جیسے مبتذل اور بازاری الفاظ استعمال کیے جائیں! اللہ کی شان دیکھیے کہ اس قوالی کو بڑے بڑے بزعم خود عاشقانِ رسول سنتے ہیں، ہزاروں کا مجمع ہوتا ہے، قوالوں پر نوٹوں کی بارش ہوتی ہے۔

اس موقع پر ایک بات کی وضاحت اور ہو جائے کہ ہمارے یہاں فلمی گانے، غزل، نظم نعت اور قوالی کو ساز و آواز کے ساتھ پڑھنے کا انداز جدا جدا ہے، لیکن فلمی گانوں کی غیر معمولی مقبولیت کی بنا پر پیشہ ور نعت خواں زیادہ تر فحش و بیہودہ فلمی گانوں کی طرز پر نعتیں پڑھتے ہیں جو بڑی گستاخی کی بات ہے۔ اس کے علاوہ ان نعتوں میں "شرک و مبالغہ کی کافی آمیزش ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد و محاسن کا بیان ہمارے ایمان کا جز ہے۔ اس لحاظ سے نعت لکھنا، نعت سُننا اور نعت پڑھنا بڑا بابرکت عمل ہے، لیکن عام قسم کی شاعری اور نعتیہ شاعری میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ عام قسم کی شاعری کے لیے ایک میدانِ وسیع موجود ہے آپ اس میں "رگِ گل سے بلبل کے پر باندھیے معشوق کی جدائی میں سر پیٹیے، دل کو کباب کیجیے، اشکوں کو لہو بنائیے، اس کی زلفِ دراز کو کالی گھٹا سے تشبیہ دیجیے لب لعلیں کو لعلِ بدخشاں کہیے، رخسار کو شعلۂ جوالہ لکھیے، حُسنِ تکلم کو کلیوں کا چٹکنا سمجھیے، کسی پر کوئی قید نہیں لیکن نعت لکھتے وقت "با محمدؐ ہوشیار" کے اصول پر عمل کرنا ضروری ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے رسولِ گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے

میں کوئی سوال کیا۔ ام المؤمنین سلام اللہ علیہا نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ آپؑ کے اس ارشاد مبارک میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ ہم رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و محاسن بیان کرتے وقت قرآنی ہدایت پر عمل کریں۔ یعنی قرآنِ حکیم نے جس انداز میں آپؐ کی تعریف و توصیف کی ہے۔ وہی انداز و طریقہ ہمارے پیشِ نظر بھی ہونا چاہیئے۔

ہمارے نعت گو شعراء نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت پر جو اشعار کہے ہیں۔ اس میں میلاد نویسوں کی بیان کی ہوئی بے سر و پا اور من گھڑت داستانیں نظم کی ہیں۔ جن کی طرف نہ تو قرآن حکیم میں کوئی اشارہ ملتا ہے اور نہ احادیث صحیحہ میں ایسی کوئی بات ہے مثلاً دائی حلیمہ کی لوریاں اور ان سے منسوب۔۔۔ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ طفولیت کے حیرت انگیز واقعات۔ اسی طرح ان شاعروں نے اپنی نعتوں میں بہت سی ضعیف و موضوع احادیث نظم کی ہیں، مثلاً لولاک لما اور شہر علم والی حدیثیں، یا یہ کہ آپؐ جب دھوپ میں سفر فرماتے تو ایک ابر کا ٹکڑا آپؐ پر سایہ فگن ہو کر ساتھ ساتھ اڑتا تھا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اگر ہم من گھڑت دیومالائی قصوں کے ذریعہ اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان کریں گے تو اس کی حیثیت کیا ہوگی وہ کون سا باشعور انسان ہے جو ان خرافات سے متاثر ہوگا، کیونکہ دنیا کے تمام زمینی مذاہب ان دیومالائی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں چین کا ایک سیاح اپنے سفرنامہ میں ایک مہنت کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ اپنی روحانی قوت سے سات سو برس تک زندہ رہا پھر اس نے ہندوستان کی سیاحت کے دوران بہت سے ایسے بھکشوؤں کا تذکرہ کیا ہے جو کئی کئی ماہ بغیر کھائے پیئے مسلسل گیان دھیان میں مصروف رہے۔ کیا آپ کی عقل ان باتوں کو قبول کرتی ہے۔

نعت گو شاعروں کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے وقت آپؐ کی بشری حیثیت کو نظر انداز کرنا بڑی نامناسب بات ہے، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو انسان کی شکل میں انسانوں کے درمیان پیدا کیا، آپؐ کی ولادت اسی طرح ہوئی جس طرح عام انسانوں کی ہوتی ہے آپؐ کی دیکھ بھال اسی طرح ہوئی جس طرح عام بچوں کی ہوتی ہے دائی حلیمہ نہ فرشتوں میں سے تھیں نہ جنات میں سے وہ مکہ کی عام عورت تھیں۔ اس طرح آپ غور کیجئے کہ عہدِ طفلی سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک پہلو بشری زندگی سے عین مطابقت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کو عہدِ حاضر کے ایک عیسائی مصنف نے ایک ہزار بڑے انسانوں میں پہلے

نمبر پر منتخب کیا ہے۔ آخر کیوں؟ وہ اس لیے کہ اس مصنف نے آپؐ کو بشری اوصاف کے آئینہ میں دیکھا اور پرکھا، اس کے لیے اس نے مافوق الفطرت واقعات کا سہارا نہیں لیا، دراصل یہی ہمارے نبی گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جامعیت و اکملیت ہے۔

جن نعت گو شاعروں نے محتاط انداز میں نعتیں کہی ہیں ان سے یہ کہنا ہے کہ نعت کہنا سب سے مشکل کام ہے عربی جیسا قادر الکلام اور ذی علم شاعر جب نعت کہنے بیٹھا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے نعت گوئی کو تلوار کی دھار پر چلنا کہا ہے۔ کیونکہ اس میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔

یاد رکھیئے! جو شاعر اس خناس میں مبتلا ہیں کہ بس ہم نے دامنِ رسولؐ تھام لیا ہے اب جو جی چاہے بکتے رہیں وہ دراصل "جنت الحمقاء" میں رہتے ہیں کیونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو قرآنی ہدایات پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، آپ نے کسی حدیث میں یہ نہیں فرمایا کہ تم نصِ قرآنی پر عمل نہ کرو مگر میرا دامنِ عشق تھامے رہو، یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ قرآنی ہدایات سے مُنہ موڑنے والے خود کو عاشقِ رسولؐ کہتے ہیں، کیا قرآنی تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر بھی کوئی عاشقِ رسولؐ بن سکتا ہے؟

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے جلیل القدر پیغمبروں کو سارے اختیارات دینے کے بعد بھی ان سے باز پرسی کی ہے اور (اگر ہم بحیثیت مسلمان "عصمتِ انبیاء" پر ایمان رکھتے ہیں) کئی مقامات پر انبیاءؑ علیہم السلام کو تنبیہہ کرنے کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جملہ انبیاءؑ و رسل علیہم السلام ہر وقت اپنے معبودِ برحق کی رضا و بخشش کی دعا فرماتے تھے۔ متعدد احادیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عبادت فرماتے تو خشیتِ الٰہی سے آپؐ کا رُواں رُواں کانپتا تھا، آپؐ نے زندگی بھر اپنے خالق و مالک سے عفو و بخشش کی طلب کی ہے۔ آپ کی تریسٹھ سالہ حیاتِ طیبہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے ہم آپؐ کے محامد و محاسن بیان کرتے وقت رہ اعتدال سے ہٹنے کا جواز پیدا کریں اس لیے نعت کہنے سے پہلے یہ احتیاط لازم ہے کہ شاعر جس پیغمبرِ برحق کی توصیف کر رہا ہے وہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہے۔

ریڈیو اور ٹی وی کوئی نجی ذرائع ابلاغ نہیں بلکہ قومی ادارے ہیں لہٰذا ان اداروں پر یہ

(بقیہ صـ ۶۹ پر)

تبصرہ کتب

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت: از مولانا محمد منظور نعمانی۔

قیمت: ۔/۱۲ روپے ملنے کا پتہ: سنی پبلیکیشنز الوہاب مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

ایرانی انقلاب بلاشبہ اس دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس انقلاب کے نتیجہ میں پہلوی خاندان کی مضبوط شاہی زیر و زبر ہو کر رہ گئی اور شاہ ایران "پھرتے ہیں میر خوار" کا مصداق بن کر دیارِ غیر میں اس طرح موت کی آغوش میں چلے گئے کہ کوئی ان پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ یہ انقلاب اسلامی اور دینی انقلاب ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سیدھا سادا شیعی انقلاب ہے اور اس کی پشت پر وہی افکار و نظریات ہیں جو شیعہ اسکول کے ہیں بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ایک تو حکومتی افراد کا معاملہ ہے کہ ان کے نزدیک دینِ اسلام اور دینی قدریں ہمیشہ ثانوی درجہ میں رہیں۔ مصالح کا دور دورہ رہا، ایسی مصالح جو بے حمیتی کے پھاٹک تک جا پہنچتی ہیں اور جن کے نتیجہ میں دین اسلام کا انگ انگ زخمی نظر آنے لگتا ہے، اُدھر بعض سیاسی رہنما اور جماعتیں ہیں جو اپنے مخصوص اغراض و مقاصد کے لیے ہر کفر کو اسلام، ہر بے دینی کو دین اور ہر فسق و برائی کو نیکی اور بھلائی کہنے پر تل جاتی ہیں، رہ گئے عوام تو ان بے چاروں کو دو وقت کی روٹی سے فرصت نہیں پھر ان کی رہنمائی کا یہ عالم ہے اس لیے ان سے گلہ بے سود۔

یہی اسباب تھے کہ "انقلاب ایران" کو ایک "عظیم دینی انقلاب" کے حوالے سے یہاں بہت سے لوگوں نے سراہا اور بعض حقیقت ناآشنا یا ضدی ایسے ہیں جو اب بھی وہی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ ہمارا پریس تو اس معاملہ میں سب سے آگے ہے، دین کا معاملہ تو بہت دور کا ہے ملکی سالمیت و استحکام تک کے تقاضے ان کے سامنے نہیں۔ ہندوستان کے اہلِ علم اور وہاں کا مظلوم سنی پریس ملت کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اس انقلاب کی اصلی حقیقت اس کے قائد خمینی صاحب کی تحریرات کی روشنی میں واضح کی ہے جس کی ایک عظیم کڑی مشہور بیدار مغز، محتاط اور فاضل عالم ربانی مولانا محمد منظور نعمانی کی یہ کتاب ہے جس کا حال ہی میں ایک اچھا اور سستا ایڈیشن مالکان سنی پبلیکیشنز نے چھاپا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ملت کے

ارباب دانش وبینش نہ صرف اس کتاب کو حاصل کر کے خود پڑھیں گے بلکہ نوجوان نسل اور بھٹکے ہوئے
مذہبوں کو بھی پڑھائیں گے تاکہ وہ حقیقت سے آگاہ ہو سکیں۔

(۲)

معجم القرآن۔ از سید فضل الرحمٰن صاحب

قیمت: ۔/۴۰ روپے۔ ملنے کا پتہ: ادارہ مجددیہ ناظم آباد نمبر ۳۔ کراچی نمبر ۱۸۔

کراچی کے مشہور عالم نقشبندی مجددی بزرگ مولانا سید زوار حسین رحمہ اللہ تعالیٰ ایک متبع سنت اور عالم باعمل شیخ طریقت ہونے کے ساتھ کہنہ مشق مصنف، مؤلف اور مترجم تھے۔ جنکا علمی وکتابی ذخیرہ ان کی حسنات کا سب سے عظیم ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرہ کو حسن وخوبی کے ساتھ چھاپنے کا سہرا مرحوم کے ایک عاشق زار خادم حاجی محمد اعلیٰ صاحب کے سر ہے جو نہ صرف اچھے کاتب ہیں بلکہ نشر واشاعت کا اچھا ذوق بھی رکھتے ہیں۔

اصل خوشی یہ ہے کہ شاہ صاحب مرحوم کے بعد ان کے فرزند رشید سید فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے والد گرامی کے اس محبوب مشغلہ کو بطور وراثت سنبھال کر ایک ایسی کتاب مرتب کر دی ہے جو قرآن عزیز جیسی مقدس کتاب کا عظیم الشان لغت کہلانے کی مستحق ہے۔ ۱۲۰۵ صفحات کی اس کتاب کے مرتب کرنے میں موصوف نے قدیم وجدید تفاسیر عربی واُردو کو ہی سامنے نہیں رکھا بلکہ قرآنِ عزیز کے الفاظ کے حل کے سلسلہ میں ہند وپاک کے ساتھ ساتھ دنیائے عرب سے آنے والے قیمتی ذخیرہ لغات اور بعض دُوسری کُتب لغت کو بھی کھنگالا اور چھانا ہے، انہوں نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے قرآن کے ایک ایک لفظ کے معانی ومفاہیم کو نہایت درجہ خوش اسلوبی کے ساتھ حل کیا ہے اور زبان کی لطافت وپاکیزگی کا خاص خیال رکھا ہے، کتاب میں مادہ کے بجائے الفاظِ قرآنی کو لکھ کر ان کا مطلب حل کیا گیا ہے کیونکہ مادہ تک رسائی ہر شخص کے بس کا کام نہیں۔ تمام الفاظ قرآنی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں۔ ثلاثی مجرد کے ابواب سے متعلق الفاظ کے ساتھ ہی ساتھ قوسین میں اظہار کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح مزید کے ابواب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جو الفاظ ایسے ہیں کہ ان کے آخری حرکات کے سبب متعدد مقامات پر آئے ہیں ان کو اسی طرح اپنے اپنے مقام پر درج کیا گیا ہے تاکہ پُورا ذخیرہ سامنے رہے۔ جو الفاظ بطور مصدر آئے ہیں ان کے مشتقات اور جو مشتق آئے ہیں ان کے مصادر نیز مفردات کی جمع اور جمع کے مفردات کا اہتمام کیا گیا ہے ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے اس سورۃ اور آیت کے نمبرات اُوپر نیچے دے دیے گئے ہیں۔ یعنی خط ڈال کر اُوپر تو آیت کا نمبر اور نیچے سورۃ کا نمبر درج کر دیا گیا ہے جس کے ذریعہ کسی بھی

لفظ کا مقام قرآن میں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے ۔۔ علوم ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ کس کس مقام پر آیا ہے۔ بہر طور مؤلف نے اپنے طور پر بے حد کاوش کی اور پھر منشی محمد اعلیٰ صاحب نے حسب روایت نہایت خوش ذوقی سے اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔ کتاب پر بعض نامور اہل علم بالخصوص مولانا مفتی محمد ضیاء الحق دہلوی سابق مہتمم و شیخ التفسیر مدرسہ رحیمیہ درگاہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی آرا ہیں جس سے کتاب کی صحت و افادیت کا اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ امید کہ قرآنی طالب علم اس تحفہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس کی قدر کریں گے۔

(۳)

صحیح اسلامی واقعات ۔ مرتبہ حافظ عبدالشکور صاحب

قیمت ۔ ۱۲/- روپے ملنے کا پتہ ۔ سنی پبلیکیشنز الوہاب مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

حافظ صاحب نے یہ کتاب کم تعلیم یافتہ لوگوں اور بچوں کے لیے لکھی ہے اور اس میں ۸۰ واقعات درج کیے ہیں جنکا تعلق اسلامی تاریخ سے ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ قصص و واقعات میں خاص دلچسپی ہوتی ہے اور ٹھوس علمی کتابوں کی طرح انمیں بوجھ کی کیفیت نہیں ہوتی۔ اور جب لکھنے والا صاحب طرز ادیب، زبان و بیان کی لطافتوں کا ماہر ہو تو دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔ حافظ صاحب کا جذبہ صادقہ اور خواہش اصلاح تو کتاب کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہوتی ہے لیکن زبان کے اعتبار سے جو سلاست مطلوب تھی وہ نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کتاب قابل استفادہ نہیں۔ استفادہ تو اس شکل میں بھی بھرپور طریق سے ہو سکتا ہے اور اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے ایمان و یقین اور علم و عمل کی دنیا میں کیا نقوش چھوڑے ہیں۔ کتاب کا خط جلی ہے اور صاف ستھری کتابت کے ساتھ ظاہری حسن و جمال کی امکانی کوشش کی گئی ہے۔ عام پڑھے لکھے لوگ اور بچوں کے مطالعہ کے لیے بہر طور اچھا مجموعہ ہے اس کی قدر کرنی چاہیئے۔

(۴)

۳۔ مولانا عبدالرحمٰن عاجز کی کتابیں سلفی مسلک سے تعلق رکھنے والے ایک عالم مولانا عبدالرحمٰن عاجز فیصل آباد میں رحمانیہ دارالکتب کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ بنا رکھا ہے جس کے ذریعہ وہ اچھی کتابیں اہتمام سے چھاپتے ہیں، اس کے ساتھ ہی ان کا اصلاحی اور تبلیغی انداز سے لکھنے کا بھی مشغلہ ہے اور یہ لکھنا نثر اور نظم دونوں میں ہی ہوتا ہے اس وقت ان کی چار کتابیں ہمارے سامنے ہیں دو نثری

دو نظم میں، نثری کتابوں کے نام موت کے سائے اور عالم برزخ ہیں۔ اول الذکر کتاب کتابی سائز کے ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں جیسی ناگزیر حقیقت پر مختلف انداز سے گفتگو کی گئی ہے اور ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ عام لوگوں میں اس کی فکر پیدا ہو انبیاء سابقین، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور بزرگان سلف کے اس ضمن میں واقعات و خطبات بھی اس سلسلے میں درج ہیں جو نہایت درجہ مؤثر اور فکر انگیز ہیں۔ دوسری کتاب عالم برزخ ہے اس کے صفحات ۳۹۶ ہیں۔ انسان جب مرتا ہے تو اس وقت سے لے کر عرصہ محشر کے قائم ہونے تک کے وقت کو عالم برزخ کا نام دیا جاتا ہے، قبر ہو یا کسی درندے کا پیٹ جس نے انسان کو چیر پھاڑ کھایا، پانی ہو جس میں انسان ڈوب گیا ہر ہی جگہ انسان راحت و کلفت سے دوچار ہوتا ہے، اس پر روایت و درایت کے اعتبار سے بڑی جامع بحث ہے اور بعض فکر انگیز واقعات بھی ہیں جو قبر سے متعلق ہیں۔

ان کے علاوہ دو کتابیں نظم میں ہیں ایک کا نام صبح صادق اور دوسری کا نام جام طہور ہے، صبح صادق پر جناب احسان دانش مرحوم اور حفیظ جالندھری مرحوم جیسے نابغہ روزگار شعرا کی تقاریظ ہیں، جو اس کتاب کے شعری طور پر مستند ہونے کی دلیل ہے اس میں مختلف عنوانات پر بڑا پاکیزہ کلام ہے جس میں سوز و گداز ہے، فکر ہے اور احساس دینی اُجاگر کرنے کی قوت ہے دوسری کتاب جام طہور کا پیش لفظ تو لکھا مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے جو ایک ذمہ دار مصنف، مؤلف اور مترجم تھے اور تقریظ ہے احسان دانش مرحوم مولانا فقیر احمد جہلمی اور پروفیسر غلام احمد حریری جیسے صاحبان علم و ادب کی جس نے کتاب کا استنادی درجہ متعین کر دیا ہے۔ اس میں بھی مختلف عنوانات حمد، نعت کے ساتھ احادیث کا منظوم ترجمہ، حرمین شریفین وغیرہ پر بڑا مؤثر کلام ہے جو اس قابل ہے کہ راگ و رنگ کے اس دور میں خوب پھیلایا جائے اور پڑھا جائے۔

یہ چاروں کتابیں اچھے انداز سے چھاپی گئی ہیں اور اصلاح و فلاح کے عنوان سے بڑی قابل قدر ہیں۔ موت کے سائے کی قیمت ۵۴/- روپے ہے عالم برزخ کے مختلف ایڈیشنوں کی قیمت ۲۴/-، ۳۶/- اور ۴۸/- روپے ہے صبح صادق کے مختلف ایڈیشنوں کی قیمت ۱۴/-، ۲۱/- اور ۲۷/- روپے ہے اور جام طہور کی ۲۰/-، ۳۰/- اور ۴۰/- ہے ملنے کا پتہ۔ رحمانیہ دارالکتب امین پور بازار فیصل آباد۔

بقیہ: نعتیہ شاعری کا انحطاطی پہلو

ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ پیشہ ور نعت خوانوں کو اس وقت نعت پڑھنے کی اجازت دیں جب وہ اس کے حسن و قبح کا جائزہ لے لیں۔۔۔اسی طرح قوالوں کو بھی اس بات کا پابند کریں کہ وہ نہ تو فحش و بیہودہ فلمی گانوں کی طرز میں نعتیہ مضامین پڑھیں نہ ان کا کلام دائرہ شریعت سے باہر ہو۔

*****

(بقیہ: مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم)

وفات سے برصغیر پاک و ہند میں جو علمی خلا واقع ہوگیا ہے اسے پُر فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی مخلص معتدل و متوازن اور بالغ نظر شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللھم اغفرلہ وارحمہ وبرد مضجعہ واجعل الجنۃ مثواہ۔

وقت کے اہم نازک اور زیر بحث موضوع

اسلام
اور
نبوت کا مقام

پر
ڈاکٹر اسرار احمد

کا مدلل و مفصل خطاب
کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے
جس میں اس خطاب کے علاوہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تالیف "نقوش اقبال" سے ماخوذ

عظمت اقبال کے کلا آثار

نیز اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کا ماہنامہ آنچل کراچی میں شائع شدہ انٹرویو اور روزنامہ جنگ کے فورم میں بات چیت بھی شامل ہیں
عمدہ آفسٹ پیپر۔ اعلیٰ طباعت۔ صفحات ۱۳۰
قیمت ——— فی نسخہ دس روپے (علاوہ محصول ڈاک)
ملنے کا پتہ
(۱) مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
(۲) مکتبہ تنظیم اسلامی۔ نیلا گنبد ۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ کراچی

سیرت نبوی کے ضمن میں دو عظیم تحفے

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی
کے دروس و تقاریر کے دو مجموعے ▬ اعلیٰ دبیز کاغذ پر خوشنما طباعت کے ساتھ

رسول کامل

یعنی پاکستان ٹی وی سے نشر شدہ ۱۲ تقاریر کا مجموعہ اور

فرائض دینی اور اسوۂ رسول

سورۂ احزاب کے رکوع ۲، ۳ کی روشنی میں

بقیہ : حرفِ اوّل

طبقات اور غریب طبقات کے مابین خلیج مسلسل وسعت پذیر ہو، اور جوں کا توں قائم ہے تو شعائرِ اسلامی کی یہ ظاہری لیپا پوتی (Cosmetic Treatment) درحقیقت عوام کو دین و مذہب سے مزدور لے جانے اور متنفر کرنے کا سبب بنے گی اور اس قسم کے ظاہری اقدامات کی بنیاد پر یہ سمجھنا کہ ہم نے دین و مذہب کی کوئی خدمت سرانجام دی ہے، محض خام خیالی اور خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔

ہمیں امید ہے کہ 'حکمتِ قرآن' کا متذکرہ بالا شمارہ نہ صرف یہ کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کو ان کے صحیح پس منظر میں (Perspective) میں سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ بلکہ اس موضوع سے متعلق بہت سے مغالطوں کو رفع کرنے کا سبب بنے گا۔ دراصل یہ ہماری جانب سے ایک کوشش کا آغاز ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کسی بھی سنجیدہ اور فکر انگیز تحریر کے لئے 'حکمتِ قرآن' کے صفحات ان شاء اللہ ہمیشہ حاضر رہیں گے ——— زیرِ نظر شمارے میں اسی موضوع سے متعلق حافظ محمد سلیمان کی ایک تحریر بعنوان "اسلام کا معاشی نظام : چند پہلو" شامل کی گئی ہے ———

پچھلے ماہ کا شمارہ چونکہ معمول سے ہٹ کر تھا۔ لہٰذا ہمارے بعض مستقل قسط وار مضامین شاملِ اشاعت ہونے سے رہ گئے تھے، ممکن ہے بہت سے قارئین کے لئے یہ چیز کوفت کا باعث بنی ہو، اس شمارے کے ذریعے وہ تسلسل ان شاء اللہ پھر سے قائم ہو جائے گا۔

عاکف سعید

یکم اکتوبر ۸۵ء

ہر ہجری سالِ نو کے موقع پر

سانحۂ کربلا

تقاریر، خطابات، مضامین اور مقالات کا موضوع بنتا ہے؟

اور اس کے ضمن میں عموماً افراط و تفریط کا مظاہرہ ہوتا ہے

ڈاکٹر اسرار احمد

کا کتابچہ

ہجری سال نو اور

سانحۂ کربلا

مع کربلا کی کہانی حضرت ابو جعفر محمد باقرؒ کی زبانی

اس موضوع پر حقیقت بینی اور اعتدال پسندی کے اعتبار سے ایسا شاہکار ہے جس نے
عوام و خواص سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے

خود پڑھیئے اور دوسروں تک پہنچایئے

۴۸ صفحات - اعلیٰ آفسٹ پیپر - قیمت تین روپے

ناشر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نمبر ۱۴

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمّت** میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ

کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے

تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی

وقت کے اہم ترین موضوع پر اِس بہترین اور مفید ترین کتاب کو

اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شایان طور پر شائع کیا ہے۔

بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ھدیہ : ۴ روپے ○ علاوہ محصولڈاک

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور خطبۂ نکاح کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور،

ہدیہ : ۴ روپے ——— محصول ڈاک علاوہ

ان دونوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اہم قومی، ملّی اور دینی فریضہ ہے